ROSHAN LAL TAKHTAR
Novel Agency. Street Dhallan Peshawar City
No روشن لال تختر ناول ایجنسی محلہ ڈھلان پشاور شہر

فہرست

مقدّمہ (از صلاح الدین احمد) ۳
۱- جنت اور جہنم ۳۳
۲- بے رنگ و بُو ۵۹
۳- آنسوؤں والی ۷۵
۴- بچپن ۹۱
۵- گل فروش ۱۱۳
۶- دو فرلانگ لمبی سڑک ۱۳۵
۷- بند والی ۱۴۹
۸- ویکسی نیٹر ۱۶۷
۹- خونی ناچ ۱۸۷
۱۰- دل کا چراغ ۱۹۷
۱۱- تلاش ۲۱۷
۱۲- سفید پھول ۲۲۹
۱۳- منگلیک ۲۵۵

ROSHAN LAL TAKHTAR
Novel Agency. Street Dhallan Peshawar City
No

مقدمہ

اردو مختصر افسانے کی عمر بہت چھوٹی ہے۔ لیکن اس چھوٹی سی عمر میں اس ہونہار نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں منشی پریم چند مرحوم اس فن کے امام تھے اور اپنی کئی ایک خصوصیات کے لحاظ سے وہ آج بھی بے مثال ہیں۔ لیکن گذشتہ چند سال میں اردو افسانہ نگاری نے چند ایسے فن کار بھی پیدا کئے ہیں جنہوں نے آرٹ اور زندگی کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے اور پھر جو کچھ لکھا ہے فن کی گہرائیوں میں ڈوب کر لکھا ہے۔ ان لکھنے والوں میں نوجوان کرشن چندر ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

کرشن چندر کی ادبی زندگی کو شروع ہوئے بہ مشکل پانچ چھ برس گذرے ہوں گے۔ اس مختصر عرصے میں اُن کے تیس تیس افسانے ملک کے مشہور

رسائل میں چھپ کر اہلِ ذوق کے سامنے آچکے ہیں اور چند افسانوں کا ایک مجموعہ بھی "طلسمِ خیال" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ موجودہ مجموعے میں ان کے بعض تازہ افسانے شامل ہیں اور جن صاحبوں کی نظر سے اُن کے پہلے افسانے گذر چکے ہیں۔ وہ غالباً محسوس کریں گے کہ افسانہ نگار پر فکر کی پختگی کا رنگ غالب آرہا ہے اور اگرچہ وہ اب بھی کسی فطری تقاضے کے زیرِ اثر زندگی کو اپنے مخصوص رومانی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے لیکن اس کی رومانیت میں حقیقت کی تلخی سرایت کر چکی ہے۔

کرشن چندر میری ناقص رائے میں ایک مجموعۂ اضداد ہے۔ وہ ادب میں رومانیت اور حقیقت پرستی، فرار اور پیکار، شادابی اور ویرانی، کامرانی اور شکست، جنت اور جہنم کا ایک دلکش امتزاج پیش کرتا ہے۔ لیکن ایک بات میں وہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے: سوسائٹی سے بغاوت میں سماج سے سرکشی میں، ضوابط سے انحراف میں۔ وہ ہماری مہذب بربریت اور متمدن وحشت کے خلاف سرتاسر احتجاج ہے، ایک سنگین مگر مرمریں احتجاج۔ وہ ہماری معاشرت کے پُرفریب آئین و رسوم پر ایک زندہ تبسم ہے، ایک تلخ مگر دلنواز تبسم۔ جب وہ زندگی کی لطیف ناکامیوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہے تو وہ اُس کے پرتو سے چمک اٹھتی ہیں۔ وہ انہیں دیکھتا ہے، ہمیں دکھاتا ہے اور خاموشی سے گذر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تلخیوں کا ایک ہجوم اُس کے

دل میں محشر بپا کئے رکھتا ہے مگر اس کے سینے کا طوفان اس کے چہرے پر خندۂ زیرِ لب کی ایک ہلکی سی موج بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ جب تک ہم سے ہمکلام رہتا ہے، اگرچہ داستانِ غم کہتا ہے لیکن ہم اُسے نغمۂ فردوس سمجھ کر سُنے جاتے ہیں، وہ ایک آئینہ ہمارے ہاتھ میں دے کر ہم سے اپنی صورت دیکھنے کو کہتا ہے، اور خود ہنسنا شروع کر دیتا ہے اور ہم بھی ہنسنے لگ جاتے ہیں، معلوم نہیں کہ اپنی بدصورتی پر یا اس شعبدہ باز کی عیاری پر۔ پھر ہم سوچتے ہیں کہ کیا وہ غالب کے اس الہام کا مفسّر تو نہیں ہے کہ ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

کرشن چندر کی یہ فن کاری، یہ شعبدہ بازی، یہ لطافت نگاری ہی اس کے آرٹ کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔

مجموعۂ زیرِ نظر کے افسانوں میں تاثراتی عنصر بہت نمایاں ہے۔ مثلاً "دو فرلانگ لمبی سڑک" بجائے خود ایک مکمل تاثر ہے اور اسی طرح "بے رنگ و بو" "خونی ناچ" اور ایک بڑی حد تک "بچپن" پر بھی یہی رنگ غالب ہے۔ اس طرز کے افسانوں کی ٹکنیک اگرچہ لازماً مغربی ہوتی ہے لیکن فن کار کی خوبی یہی ہے کہ فضا میں اس قدر مقامی رنگ ہو کہ پڑھنے والا شدتِ ہم آہنگی سے تڑپ اٹھے۔ کرشن چندر اس ٹکنیک کے ماہر ہیں اور وہ اسے بڑے سلیقے سے

نبھاتے ہیں۔ دیکھئے :-

"کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گذرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل کبھی سائیکل پر سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے اور نہ چھاؤں سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے متواتر نو سال سے اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف، سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے اور اب اس پر کول تار بھی بچھی ہے جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے"۔

بظاہر یہ ایک معمولی سڑک کا بیان ہے۔ مگر فن کار کی دور اندیشی اس ایک جھلک سے سارے افسانے کی فضا تیار کر لیتی ہے بلکہ ہماری ناچیز رائے میں یہ ٹکڑا اپنے اندر زندگی کی وہ ساری سختی اور سیاہی، ہماری معاشرت کی وہ سنگدلانہ ہمواری اور سیدھ اور ہمارے نظام مجلسی کی وہ بے رحمانہ بہش اور کرختگی رکھتا ہے جس کے خلاف اس افسانے کے مختلف مناظر میں احتجاج کیا گیا ہے۔ ہم میں سے اکثر کی زندگیاں اسی سڑک کی طرح بے کیف ہیں، اسی کی طرح مختصر، اور اسی کی مانند جھلسی ہوئی۔ اور ان کے واقعات و مصائب اُن سوکھے سوکھے بدصورت درختوں کی طرح ہیں جو اس سڑک کے دونوں

طرف منحوس گدھوں کو اٹھائے کھڑے ہیں۔فن کار نے سارے افسانے کی روح تاثر کے اس چھوٹے سے پارے میں کھینچ کر رکھ دی ہے یا شاید زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس نے اسی تاثر پارے سے اپنے افسانے کا سارا تار و پود تیار کیا ہے۔آنے والے مناظر میں سے ایک آدھ کی جھلک دیکھئے:۔

"دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، اپلوں کے ٹوکرے اٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گذر رہی ہیں۔جوان عورت کی چال تیز ہے،

"بیٹی ذرا ٹھہر تو" بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھرّیاں ہیں۔اس کی چال مدھم ہے۔اس کے لہجے میں بے کسی ہے۔

بیٹی، بس، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی ..... میرے اللہ۔

امّاں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تو تو باولی ہوئی ہے،

اچھا بیٹی، اچھا بیٹی،

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔اس کی جھرّیوں میں غم ہے اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی ....

ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے،ایک سُست مضمحل کُتا فٹن کے پہیّوں تلے آگیا ہے۔اس کی پسلی کی ہڈیاں

ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہ رہا ہے اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے۔ اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔"

دو تصویریں، بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ، افلاس زدہ جوانی اور غربت کا بڑھاپا ایک طرف، تموّل اور حرص پر پلنے والا بڑھاپا اور جنسی دباؤ سے لچک کھا کھا کر ابھرنے والی خوشحال جوانی دوسری جانب۔ فرائڈ کو شاید ہندوستان آنے کا موقعہ کبھی نہیں ملا ورنہ وہ اپنے نظریے میں غالباً اس قدر ترمیم ضرور کر لیتا کہ اس ملک کی مفلسی جذبۂ جنسی کی اولیت کے لئے ایک زبردست چیلنج ہے اور بسا اوقات وہ اس پر غالب آکر اس کا نام و نشان تک مٹا دیتی ہے۔ اُپلے اٹھانے والی عورت کو گھر پہنچ کر روٹی پکانے کی فکر ہی کھائے جاتی ہے۔ وہ روٹی پکانے والے نوکر سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے والی اُس امیر عورت سے کیوں کر کوئی جذباتی اشتراک کر سکتی ہے، جس کا جنسی اظہار ایک دولت مند مگر مصروف شوہر کو متاثر نہیں کرتا۔ نتیجہ دونوں کے لئے صفر۔ زندگی، ایک کے لئے سطح پر ہی بے کیف، دوسری کے لئے انجام کار بے مزہ۔ بوڑھا حریص دولتِ شباب سے محروم ہو چکا ہے

لیکن شباب سے انتقام لئے جارہا ہے۔ اس کی بھوکی آنکھیں بدحال بھکارن اور خوش لباس حسینہ میں کوئی امتیاز نہیں کرتیں اُسے انتقام سے غرض ہے اور اُس کی یہ غرض پوری ہوئے جارہی ہے۔ مگر انجام؟

جنسی بھوک کی پکار کرشن چندر کے اکثر افسانوں میں گونجتی ہے اور پڑھنے والے کی روح میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اس موضوع پر کرشن چندر ایک خاص سلیقے سے قلم اٹھاتے ہیں اور اُن کے بیان کی نزاکت مطالب کو اس طرح چھپاتی اور بے نقاب کرتی ہے جیسے شبنم کا نقاب کسی حسینہ کے چہرے کو۔ درحقیقت جنسی رجحانات اور اُن کی مختلف کیفیتوں کو ہمارے سنجیدہ ادب میں اب تک ممنوعات میں سے سمجھا جاتا رہا ہے اور اسی لئے ان پر جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے اُس کا فنی پایہ چنداں بلند نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مشہور افسانہ نگاروں نے جرأت سے کام لے کر اس ضروری مبحث پر خامہ فرسائی کی ہے مگر اکثر اوقات وہ بہت تیز اور دھڑکا دینے والی چیزیں لکھ جاتے ہیں۔ کرشن چندر کا انداز ان سے اس حد تک مختلف ہے کہ وہ کہنے کی باتیں مزے مزے سے کہہ جاتے ہیں اور مخاطب چونکتا تک نہیں۔ ذرا دیکھئے:۔

"دروازہ کھلا تھا۔ ایک چھوٹا سا دالان، اس کے آگے کھلا آنگن، جس میں پانی کے نل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بدصورت فربہ اندام عورت نہا رہی تھی۔ بغیر کسی جھجک کے بولی "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں!

میں نے دل میں کہا " اور کیا تمہیں دیکھنے آیا ہوں" جیسے اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو، بولی اچھا آپ ذرا دالان میں ٹھہریئے۔ میں ابھی آتی ہوں..."

"ایک نوجوان عورت چپکے سے کہیں سے نکل آئی تھی، اچھے نقش تھے لیکن چہرہ کچھ اترا ہوا کچھ اداس سا، بڑی بڑی آنکھیں، لیکن ملول، رنجیدہ لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ لیکن پھیکی، تاسف انگیز، گویا کہہ رہی تھی، اس سے کیا فائدہ، وہ دن بھر دفتر میں کلرکی کرتے ہیں اور میں لبوں پر سرخی لگا کر برتن مانجتی ہوں..... نوجوان عورت کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم یہ مکان لے لیتے، مجھے تمہاری محبت تو درکار نہ تھی، اور میں اس قسم کی باتوں کو پسند بھی نہیں کرتی لیکن یوں ہی دل بہلا رہتا۔ وہ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں۔ صبح سے شام تک۔ تم کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیا کرتے اور میرے لبوں کی سُرخی چمک اٹھتی، کیا ہی اچھا ہوتا...." ۵

(بے رنگ و بو)

بنئے کی بیوی کا رنگ ذرا اکھلتا ہوا سا ہے اور وہ ہمیشہ مینا کی طرح چہکا کرتی ہے۔ دکان پر کام کرتی ہے گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی ہے۔ نگر کے کنوارے لڑکے، بدصورت بیویوں کے ادھیڑ خاوند، پوربئے، دھوبی، نائی، موچی اور اکھاڑے میں کشتی لڑنے والے پہلوان سبھی بنئے کی دکان سے سودا لیتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر کپڑے کتراتے ہیں، بڑی رغبت سے، یا بنئے کی بیوی سے

"سوڈا واٹر کی ایک بوتل کھول دینا" اور آج تو بنیائن خوب بنی ٹھنی ہوئی ہی ہے"

.... اور بنیئے کی بیوی بوتل سے کاگ اڑاتے ہوئے کہتی ہے "ہٹ مردود"

(دل کا چراغ)

معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر کو بدصورت عورتوں سے بڑی عقیدت ہے ایک اور جگہہ بھی وہ بدصورت عورتوں سے اپنی دبی ہوئی دلچسپی کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

"ان میں کہیں موٹے موٹے مردوں کے ساتھ پری وش عورتیں سوار تھیں جن کے چہرے اور جن کے طلائی آویزے دوپہر کی دھوپ میں یکساں طور پر چمک رہے تھے۔ کہیں تنومند، وجیہہ نوجوانوں کے ہمراہ بھدی اور بدشکل عورتیں اپنے بہترین لباس پہنے بیٹھی تھیں، اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں معلوم ہوتی تھیں جو عورت جتنی زیادہ بدصورت تھی وہ اتنا ہی اچھا لباس پہنے تھی۔ دراصل پردے کی رسم تو ان ہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی، اور ان کے شوہروں کے چہرے کم ازکم اس وقت تو اسی خیال کے آئینہ دار تھے۔ بیچارے دوسرے شکاروں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت عورتوں کو گھور گھور کر اپنے نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے، اور ان کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب میٹھی آواز میں ہنس ہنس کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، کم ازکم مجھے اُن کی آواز بہت شیریں معلوم ہوتی۔ شیریں جیسے کوئل کی کوک، اور آخر

کوئل کا رنگ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے۔" (جنت اور جہنم)

بظاہر ایک مذاحیہ پارہ لیکن درحقیقت زندگی کا ایک الم ناک نوحہ!

ہماری معاشرت کی ناہمواریاں افسانہ نگار سے قدم قدم پر اپنا خراج وصول کرتی چلی جاتی ہیں موجودہ مجموعے کے بعض افسانے ایسے ہیں جن کا مرکزی خیال کوئی نمایاں سماجی یا معاشرتی مسئلہ ہے مثلاً دل کا چراغ کہ جاہلانہ مذہبیت اور نام نہاد قومی عصبیت پر ایک زبردست چوٹ ہے منگلیک، کہ سماجی پابندیوں اور نیم مذہبی اوہام کے بخیئے اُدھیڑتا ہے، جنت اور جہنم کہ افلاس اور اخلاقیات کے باہمی رشتے پر ایک دلکش طنز ہے۔ خونی ناچ کہ ہماری شہری زندگی اور اس کے بورژوا طلسم کے خلاف دیہات کے سادہ اور بے خبر افلاس کی ایک دلدوز چیخ ہے۔ ان افسانوں کی ایک پسندیدہ خصوصیت یہ ہے کہ فن کار مرکز کی طرف ایک بے پروایانہ آہستگی اور ایک دل آویز بے نیازی سے قدم بڑھاتا ہے اور اثنائے راہ میں اُن نازک تاثرات کے چمن کھلاتا جاتا ہے جن کے رنگین و معطر شگوفے اس کے ذہن کی شادابیوں میں پرورش پا چکے ہوتے ہیں۔ ہم اس عالم رنگ و بو کی سیر میں ہمہ تن محو ہوتے ہیں کہ یکایک مرکزی نکتہ اپنی تمام قوت اور روشنی کے ساتھ ہمارے شعور پر چھا جاتا ہے اور پھر جب اس کی گرفت کچھ کم ہوتی ہے تو ہمیں وہ دھندلے نشانات راہ دکھائی دینے لگتے ہیں جن کے پاس سے گذر کر ہم منزل تک پہنچے تھے،

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان افسانوں میں وحدتِ تاثر نہیں ہے۔ ہے اور یقیناً ہے مگر اس کے اظہار میں افسانہ نگار کسی قسم کی کرخت عریانی سے کام نہیں لیتا۔ وہ سائے کو پیکر کی جگہ پیش کرتا ہے، عکس سے اصل کا کام نکالتا ہے۔

ایسی کہانیوں کے علاوہ جن کے مرکز بعض اہم معاشرتی مسائل کے گرد گھومتے ہیں، کرشن چندر کے بیشتر افسانے نفسیاتِ انسانی کے نہایت حیرت انگیز مطالعے ہیں۔ ان میں انسانی فکر و احساس کی بے شمار ایسی باریکیاں اور واردات پیش کی گئی ہیں جن سے بظاہر ایک اوسط درجے کے دل و دماغ کو ہر روز واسطہ پڑتا ہے، لیکن جن پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کیا جاتا اور جن میں ایک اوسط درجے کے افسانہ نگار کے لئے کوئی جاذبیت نہیں پائی جاتی۔ مجموعہ زیرِ نظر کے افسانوں میں اس نزاکتِ خیال کی بہترین مثال تلاش ہے۔ یہ دلکش رومانی مطالعہ نہ تو کوئی اخلاقی سبق دیتا ہے نہ کسی سماجی برائی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور نہ کسی گہرے نفسیاتی عقدے کا حل پیش کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف حسن خود بین و خود آرا کی یورشوں سے تنگ آکر قدرت کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ ایسے حسن کی تلاش میں ہے جو کاملاً خود فراموش ہو۔ یہ نقشِ جمیل اس تلاش کی رنگینیوں اور ناکامیوں کی ایک لطیف داستان ہے۔

اس افسانے کی رومانی فضا سے قطع نظر اس مجموعے کے بیشتر افسانے اسی قسم کی نفسیاتی تراکیبوں کے آئینہ دار ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا رنگ

جداگانہ ہے اور بعض میں تو لطیف ترین احساسات نے بھی اظہار کی نہایت موثر صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ مثلاً بے رنگ و بو، سفید پھول، اور وِکیسی نیٹر ہیں۔

"بے رنگ و بو" میں مصنف نے اپنے پہلے رومانی رنگ سے جی کھول کر انتقام لیا ہے اور ہماری صبر آزما زندگیوں کے رہے سہے کیف کو بھی ہمارے دلوں سے گویا کھرچ لیا ہے۔ سفید پھول بے زبان محبت کی حیرت ناک فصاحتوں، نام نہاد اہنسا کی انسانیت سوز ستم رانیوں اور اس ظالم معاشرت کی عملی قیمتوں کا ایک نادر مرقع ہے اور وِکیسی نیٹر کا لطیف ترین نفسیاتی پہلو ذہنِ انسانی کی اس خصوصیّت کا اظہار ہے جسے انگریزی اصطلاح میں سمبلزم (علامیّت) کہتے ہیں۔ جاگیردار کے محل کے برج ایک خوفناک عفریت کی طرح وِکیسی نیٹر کی روح پر چھائے رہتے ہیں اور اُن کی چمک اُس کی محبت کی افسردہ راکھ میں انتقام کی ایک عذاب دہ تپش برقرار رکھتی ہے۔

بندو اکی۔ آنسوؤں والی اور بچپن میں نسوانی فطرت کی خاموش اثر پذیری کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ مرد محبت کو عموماً ایک خوش آئند خواب یا ایک ہنگامی دلچسپی سمجھتا ہے۔ لیکن عورت بسا اوقات اسے اپنے کلیجے کا ناسور بنا لیتی ہے۔ اس لحاظ سے فیروزہ انجنیئر، اور رفیع میں ایک طرف اور فربزی، نیرا اور نیلا میں دوسری جانب محض ایک درجاتی فرق ہے ورنہ بنیادی طور پر

تینوں جوڑے ایک ہی سی خصوصیات رکھتے ہیں۔ وہی ہنگامی جذبہ پروری ایک طرف، وہی گہری وارفتگی دوسری جانب۔ رفیع شاید اپنے رفیقوں سے کچھ بہتر تھا مگر اس کی گریز پا دلچسپی ان بادلوں سے مشابہ تھی جن کی تصویریں افسانہ نگار نے دو نہایت معنی خیز موقعوں پر کھینچی ہیں۔ پہلی تصویر دونوں کے بچپن سے نسبت رکھتی ہے:۔

"جب رفیع کے گھر کے لوگ روانہ ہونے کو تھے اور رفیع کو ایک گھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا۔ نیلا سسکیاں لیتی ہوئی رو پڑی، رفیع کا دل بے تاب ہو گیا۔ لیکن اُس وقت اُس نے نہایت ہمت سے کام لیا اس نے اپنے آنسو روک لئے اور منہ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔"

اب دوسری تصویر دیکھئے دونوں جوان ہو چکے ہیں اور نیلا ایک بچے کی ماں بن چکی ہے:۔

"رفیع نے آگے بڑھ کر اور بچے کے شانوں کو چھو کر کہا۔ یہ تمہارا لڑکا ہے نا، کتنا خوبصورت ہے۔ اس کا کیا نام ہے؟

نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا ہاں، اس کا نام ہے یحییٰ، محمد یحییٰ،

کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا۔ نہ اس کے پاؤں تلے زمین تھی اور نہ سر پر آسمان، وہ خلا میں گھوم رہا تھا، نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا ...... رفیع بچے کی طرف جھکا پھر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب کے اندر سے کوئی چیز نکالی، یہ سبز موتیوں کی ایک مالا تھی۔ آہستہ سے اُس نے یہ مالا بچّے کے گلے میں ڈال دی۔

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چھکنے لگے لیکن رفیع نے نہایت ہمّت سے کام لے کر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا اور نگاہیں اٹھا کر گھاٹی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔"[1]

اب ذرا سوچیے کہ کیا ہم میں سے اکثر کے افسانہائے عشق ان سفید سفید بادلوں کی سی گریز پائی اور بے ثباتی کے آئینہ دار نہیں ہیں!

اسی طرح جب آنسوؤں والی کا ہیرو انجنیئر جیسے معصوم نیراگاٹیاں کی فردوس نما وادی میں کوٹ کا دامن پکڑ پکڑ کر روکتی تھی ان دل افروز گھڑیوں کی کہانی بیان کرتا ہے تو انجام کے قریب یہ کہہ کر کہ

اُس کا جاں گداز نغمہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتا لیکن اس گیت کی وہ لے، وہ اس کا لازوال حُسن، تڑپ اور درد آج تک میرے کلیجے میں محفوظ ہے .....

"انجنیئر چُپ ہو گیا، کمرے میں کتنی دیر تک خاموشی طاری رہی، آگ مدھم

[1] CHILD IS THE FATHER OF THE MAN

ہو چکی تھی اور دیواروں پر لمبے لمبے سائے ناچ رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد میں نے آرام کرسی سے سر اٹھایا اور انجنیئر کی طرف مڑ کر پوچھا، کیا تم پھر کبھی نیرا سے ملے۔؟

لیکن انجنیئر سو گیا تھا، اس کا سگار اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا اور غالیچے پر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔"

کسے خبر ہے کہ عشق کا جاں افروز شعلہ گاٹیاں کی تنہا وادی میں کب تک روشن رہا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ پریت کہانی کہتے کہتے سو جانے والے صاحب کے دل میں یہ اسی طرح سرد ہو چکا تھا جیسے اس کے ہاتھ سے گر جانے والے بے جان سگار میں آگ کی چنگاری۔ اور اب آپ نے سمبل ازم کا ایک اور اعجاز دیکھا! بجھا ہوا سگار، بھدوس اور بدصورت، اور بجھا ہوا مادہ پرست، رومانیت سے یکسر محروم دل۔ ایک انجنیئر کا دل۔

احساس کی نزاکت کے ساتھ ساتھ اگر آرٹسٹ کو مطالعے کی گہرائی اور مشاہدے کی وسعت بھی ارزانی ہو تو اس کا فن تکمیل کی منازل بہت جلد طے کر لیتا ہے۔ قدرت نے اس بارے میں کرشن چندر سے بہت فیاضی کی ہے ان کی باریک بینی اور ژرف نگاہی زندگی کے خس و خاشاک میں سے چھوٹی چھوٹی لیکن بامعنی حقیقتوں کو یوں چن لیتی ہے جیسے کوئی طاقتور مقناطیس باریک باریک سوئیوں کو اور پھر ان سے وہ اپنے افسانوں کی نادر جزئیات ایسی

خوبصورتی سے تعمیر کرتے ہیں کہ افسانہ حقیقت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"بھائی دروازے پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا "مجھے یہیں اُترنا ہے۔ ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اٹھایا اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ تانگے والے نے چابک لے کر گھوڑے کا رُخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا اور قریب کی ایک دُکان سے پان لینے چلا گیا۔ مزدور بولا "اسباب اٹھاؤں جی"

"اٹھاؤ۔ خیلدار روڈ پر لے چلو، یہاں سے قریب ہی تو ہے، ایک آنہ دیں گے"۔ (خونی ناچ)

آپ نے دیکھا، تانگے والے کا پیسے پاتے ہی قریب کی دکان سے پان لینے چلا جانا جزئیات کا کیسا حیرتناک مطالعہ ہے۔ ایک اوسط درجے کا افسانہ نویس اس چھوٹے سے واقعے کو قطعاً نظر انداز کر جاتا کیونکہ جہاں تک افسانے کی ساخت کا تعلق ہے یہ اس کے کسی مصرف کا نہیں، اور غالباً شعوری طور پر وہ اس قسم کی چیزیں کبھی دیکھتا بھی نہیں، مگر ہمارے افسانہ نگار کے اس چھوٹے سے بچے نے کہانی میں نہ صرف ایک ناقابلِ بیان روانی پیدا کر دی ہے بلکہ اس کے پیکر میں زندگی کی ایک روح دوڑا دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مطالعہ و مشاہدہ کی یہ باریکی اور پھر اظہار کی ایسی ساختگی ایسی فنی

خوبیاں ہیں جو بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہیں۔

کرشن چندر کا نام ہمارے ہاں کے باقاعدہ مزاح نگاروں میں نہیں لیا جاتا اگرچہ مزاح برائے مزاح کے طور پر بھی انہوں نے بعض اچھی چیزیں لکھی ہیں اور اس میں تو قطعاً کوئی کلام نہیں کہ ان کے اکثر سنجیدہ افسانوں میں بھی ہمیں ایک نہایت لطیف مزاح کی جھلکیاں بار بار نظر آتی ہیں اور طنز تو گویا ان کے سٹائل کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں دل کا چراغ تو نہ ناچ، بے رنگ و بو، اور دو فرلانگ لمبی سڑک۔ خالص طنزیہ چیزیں ہیں۔ در کسی حد تک منگلیک اور جنت اور جہنم بھی ان افسانوں کی دل آویز بناوٹ بں طنزیہ عناصر کچھ ایسے گھل مل گئے ہیں کہ طنز کی تلخی کام و دہن کو خوش آئند علوم ہوتی ہے۔ مثلاً دیکھئے طنز اور مزاح کا ایک دلکش امتزاج:۔

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی تو چار بجے تھے اور خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے سڑک پار اُس پار سکھ دکاندار کی دُکان سے سکھ منی جی کے پاٹھ کی آواز آ رہی تھی....

آواز ذرا مِنچی ہوئی تھی، ایسی آواز جو اپنی پاکیزگی کے باوجود میرے کانوں کو تیز معلوم ہوئی۔ گویا کہہ رہی تھی، مردود تجھے اپنے خالق کا کچھ پاس نہیں کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے، شرم نہیں آتی تجھے،...... اُٹھ اُٹھ بے شرم، کافر، ملحد دہریئے، آواز اونچی ہو رہی تھی، تھراتی ہوئی لرزتی ہوئی۔ گویا اپنے آپ کو

ربِ عظیم کے آستانے پر نچھاور کرتی ہوئی میری کھڑکی کے اندر چلی آرہی تھی۔
میں نے نیند سے بھرے ہوئے پپوٹوں کو اٹھائے بغیر ہی کھڑکی کے پردے
گرا دیئے۔ کھڑکی بند کر دی اور لحاف منہ اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر سو
گیا۔ لیکن میرے اللہ وہ آواز ابھی تک آرہی تھی۔ اور اب تو گویا چلا چلا کر
کہہ رہی تھی، اُٹھ اُٹھ .....

"اُٹھ فریدا ستیاں تے من دا دیوا بال" (اے سوئے ہوئے فرید اُٹھ اور دل کا
چراغ روشن کر دے) گو میرا نام فرید نہیں، پھر بھی میں نے اب یہی مناسب
سمجھا کہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاؤں اور میز پر رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ کو روشن کر
دوں..... اب مجھے آنکھوں میں ایک جلن اور چبھن محسوس ہو رہی تھی۔
اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ آواز نہ تھی بلکہ سوئیاں اور کانٹے تھے جو میری آنکھوں
میں چبھ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول دی۔ ایک
زناٹے دار آواز آئی۔

اُٹھ فریدا ستیاں تے من دا دیوا بال
صاحب جنہاں دے جاگدے نفراں دی سونے نال

(اور جب تیرا صاحب جاگ رہا ہو تو اے بچے کے بچے تجھے سونے کا کیا حق ہے؟)
(دل کا چراغ)

اور پھر جب یہ دھرم کرم کے چرچے اور دین داری کی باتیں اپنا رنگ لاتی

قصاب اور نہنگ آپس میں بٹ چکے، نگر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور درشن سنگھ گرنتھی شکارپور کے کسی گمنام گوردوارے میں اور منکوں والے پیر صاحب جلال پور کے کسی اندھیرے تکیے میں جا چھپے تو

"اب مجھے صبح چار بجے کوئی نہیں جگاتا۔ بابو جی، جو دوسرے حصے میں ہیں اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی، کے ریکارڈ نہیں بجاتے۔ کیونکہ وہ فساد میں ٹوٹ گئے تھے۔ اب کوئی دل کا چراغ روشن کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اب بالکل امن ہے لیکن میں پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر روز شکارپور اور جلال پور کی خبریں پڑھ لیتا ہوں۔" (دل کا چراغ)

منگلیک اگرچہ ایک ٹریجیڈی ہے لیکن اس کے المناک انجام کو ابھارنے کے لئے مکالمے کا بیشتر حصہ مزاح کی ہلکی ہلکی لہروں سے معمور ہے اور یہی بات ویکسی نیٹر میں پائی جاتی ہے۔ مگر منگلیک کا مزاح ویکسی نیٹر کے مزاح سے اتنا ہی مختلف ہے جس قدر کہ دونوں افسانوں کے کردار۔ پران اور رشید دو سلجھے ہوئے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور اگرچہ نوجوانی کی بہت سی شوخیاں اُن کی گفتگو سے ٹپکتی پڑتی ہیں لیکن اُن کی ظرافت کا انداز نسیم جاہل ویکسی نیٹر کی بے ربط گفتگو سے بالکل مختلف ہے۔ موخر الذکر کی ایک جھلک دیکھئے:۔

"پنڈور کی وادی میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ لیکن وہاں اگر تم نے رشیماں کو نہ دیکھا تو سمجھ لینا کہ تم نے پنڈور میں کچھ نہیں دیکھا۔"

"سچ سچ" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"خدا کی قسم" ——— پولیس سارجنٹ نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہوا لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دل میں گھر کر گیا۔ آخر وہ بھی ایسی کیا حسین پری ہوگی! ان پولیس والوں کی باتوں پر اعتبار کم ہی کرنا چاہئے۔ اور پھر عورتوں کے متعلق تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے ....."

کرشن چندر اپنی طنز کا سب سے پہلا نشانہ ہمارے معاشرت کے کھوکھلے پن اور ہماری انفرادی زندگی کی نمائش بازی اور اُس فریبِ نفس کو بناتا ہے۔ جس میں ہم سب کے سب مبتلا ہیں۔ دو فرلانگ لمبی سڑک اس کے ترکش کا غالباً سب سے زہریلا تیر ہے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ ابھی آپ کو اس جواں سال مگر پختہ فکر ادیب کے فن کی چند اور خصوصیتوں سے بھی متعارف کراؤں مگر جگہ کی کمی قلم کو روک رہی ہے اور ابھی ان افسانوں کی ان دل آویزیوں کا ذکر باقی ہے جو زبان و بیان سے تعلق رکھتی ہیں مگر اس سے پہلے کہ ہم ان پر ایک نگاہ ڈالیں، مجھے مصنف کی صرف ایک اور ممتاز خصوصیت کا ذکر کر لینے دیجئے۔ میری مراد نفسیاتِ طفلی سے اُس کی حیرت انگیز واقفیت سے ہے۔ رفیع اور نیلا کے کردار دو ایسی مکمل

تصویریں پیش کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہم میں سے ہر مرد اور ہر عورت کو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے اور فقط یہ کہنا کہ بچپن یاد آجاتا ہے، ان تصویروں سے شاید پورا انصاف نہیں ہے۔ ہم ان مطالعوں کی حیرت انگیز جزئیات میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وقت نے چلتے چلتے ایک الٹی زقند لگائی ہے اور ہم پھر اسی سنہری عہد میں سانس لے رہے ہیں، اور ہمارے ولولے اور ارادے ہمارے احساسات اور جذبات، ہمارے افکار اور اندیشے اپنے فرسودہ لباس اُتار اُتار کر صبحِ زندگی کی عریانیوں میں جذب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اور اب کرشن چندر کے طرزِ نگارش کی نسبت چند لفظ۔ کرشن چندر اس مفہوم میں "اہلِ زبان" نہیں ہیں، جس مفہوم میں دہلی اور لکھنؤ اور ان کے آس پاس کے رہنے والے اہلِ زبان کہلاتے ہیں ورنہ یوں تو اردو زبان پر ہم اہلِ پنجاب کا بھی غالباً ویسا ہی حق ہے جیسا کہ کسی اور خطّے کے رہنے والوں کا۔ ہاں تو اس معنی میں "اہلِ زبان" نہ ہونے کے باوجود کرشن چندر کا انداز تحریر ایسا شگفتہ، بے ساختہ، اور دل آویز ہے کہ اس پر "زبان والے" بھی رشک کھائیں تو تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ممکن ہے کہ اُن کے ہاں محاورے کا چٹخارہ اور روزمرّہ کا کرارا پن نہ ملے۔ لیکن بیان کی بہت سے ایسے کرشمے اور تحریر کے بہت سے ایسے اعجاز ان کے ہاں نظر آتے ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود الفاظ کے حُسن، بندشوں کی نزاکت اور مطالب کی گہرائی کے لحاظ سے ایک شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ بعض دفعہ وہ ایک سیدھی

سی بات میں مطالب کا ایک جہان بسا دیتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال دیکھئے۔ "سفید پھول" میں نینا اور گونگے کبالا کی پہلی ملاقات کا باعث نینا کا راستہ بھول جانا تھا۔ اس واقعے کو مصنف تفصیل سے بیان کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ہمیں ایک نفسیاتی منظر دکھاتا ہوا یوں لکھتا ہے۔

"جس دن نینا راستہ بھول کر کبالا کے دل میں اُتر آئی تھی، اُسی دن سے کبالا کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے زمین کے سوئے ہوئے سب سپنے جاگ اُٹھے ہیں۔ ہینڈر کے خلد زاروں میں ایک نئی رعنائی اور دلکشی آگئی ہے۔ اس کی روح میں خوشی اور غم کی حدیں پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ شاید اگر وہ گونگا نہ ہوتا تو اس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا۔ اگر اس کی زبان نینا سے اس کے دل کا مدعا کہہ سکتی تو شاید اس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ....."

آپ نے بیان کی خوبی ملاحظہ کی۔ نینا کا راستہ بھول کر کبالا کے دل میں اُتر آنا نزاکتِ بیان اور حقیقت نگاری کا کیسا دل افروز امتزاج ہے اور عاشق کی روح میں محبت کی مسرت اور اپنی بے بسی کے غم کی حدوں کا باہم مل جانا ایک نادر نفسیاتی واقعے کا کس قدر کامیاب اظہار ہے۔

تاثر کی شدت کسی ادبی تخلیق کو جس بلندی پر پہنچا سکتی ہے، اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے خلوص شاید بجائے خود ایک بہت بڑی فن کاری ہے مخلص افسانہ نگار خود اپنے افکار

سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق گویا اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اظہار بے پناہ قوت اختیار کر لیتا ہے اور فن کی تمام خوبیاں سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

"انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اسے (سڑک کو) ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو، ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں۔ میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔"

سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ یہ دو فرلانگ لمبی سڑک!....."

تاثر کی شدت کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے خود الفاظ زندہ ہو گئے ہیں اور اپنے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر دو فرلانگ لمبی سڑک پر پاگلوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔

کرشن چندر کی دل آویز تشبیہیں اور استعارے پھولوں کے گہنے ہیں جو

وہ اپنی قلمی تصویروں کو پہناتا ہے اُسے نیچر سے جو فطری لگاؤ ہے، وہ اُس کی رنگین تشبیہوں میں اُبلا پڑتا ہے۔ اور وہ ان سے نہ صرف حُسنِ بیان اور تزئینِ مطالب کا کام لیتا ہے بلکہ افسانے کی فضا کو ایک کیفِ جانفزا سے معمور کر دیتا ہے۔

دیکھئے:۔ "ریشماں کے نازک لب، سُرخ مسار، محجوب سے لب جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی پشیمان ہوں، اس کے نازک ہاتھ۔ مرمریں انگلیوں کی پودیں جنگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین۔ اس کی چال جیسے دوشیزۂ بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آگئی ہو۔ اس کی آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی بنسری کی طرح میٹھی اور اُبلتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لوچ دار اور اس کا قد، فارسی کا ایک شعر..... اور جب میں نے وفورِ شوق سے بے اختیار ہو کر اپنے لب اُس کے لبوں پر رکھ دیئے تو مجھے معلوم ہوا کہ ان ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی سی مٹھاس ہے اور دہکتے ہوئے انگاروں کی سی گرمی اور جلن۔ دونوں ہی احساس تھے، ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک جاں بخش اذیت"۔ (ویکی نیٹر)

اور اب ایک اور دلنواز تصویر:۔

"ساری فضا میں صبح کا سناٹا تھا۔ نہ ہوا چل رہی تھی، نہ پرندوں کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کیونکہ جب دُھند آجائے تو پرندے بھی خاموش ہو جاتے ہیں، اس گونگی دنیا میں کیا لاپہاڑی جھرنے سے نہا کر واپس آرہا تھا کہ راستے میں ایک چٹان

پرسے کھڑے ہوئے اُس نے دھند کی دیوی کو دیکھا ہاں۔ یہ دھند کی دیوی ہی تو تھی۔ سرو قامت، سر سے پاؤں تک ایک سفید ساری میں ملبوس۔ اس کا چہرہ کبالا کو ایسا معلوم ہوا گویا شبنم کے قطروں میں دھلا ہوا گلاب کا پھول دھند کی ہلکی اور سپید لہروں میں تیر رہا ہے وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور منہ کھولے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دھند کی دیوی نے کہا میں راستہ بھول گئی ہوں میں نینا ہوں۔ مجھے گاؤں کا راستہ دکھا دو......" (سفید پھول)

اسی افسانے میں نادر تشبیہات کا ایک اور سلسلہ نظر پڑتا ہے جو کہانی کی فضا اور پس منظر سے بدرجۂ غایت ہم آہنگ ہے۔ بودھ لوگوں کی ایک بستی کا بیان ہے اور افسانے کی فضا پر بودھ مذہب اور کلچر کا رنگ نکھر رہا ہے۔ ایسے ماحول میں فسانہ نگار فطرت کی نیرنگیوں کا ایک غیر معمولی منظر پیش کرتا ہے اور ایسی موزوں تشبیہات بروئے کار لاتا ہے جن سے فطرت کے مظاہر میں ایک شخصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دلچسپ اور پراسرار شخصیت۔ رات کی رانی کے رقص میں تبتی لاماؤں کی ساحرانہ بنشوں کا ہراس انگیز کیف ملاحظہ کیجئے:۔

"جب کبالا نے چیتل کو مکمل کر لیا تو اس وقت مغرب میں شفق کی سرخی بھی باقی نہ رہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑوں پر سیاہ بادل امڈ آئے تھے اور اپنے سانس روکے ہوئے پہاڑی کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے، تب دھیمے سے ایک انگڑائی لے کر رات کی رانی جاگ اٹھی اور اُس نے بادلوں کو اپنے گرد پا کر خوشی اور

مستی سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے پازیب کی جھنکار بودھ مندر کے منگولی
برجوں اور گاؤں کی منقش چھتوں میں لرزتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی کلائیوں
میں پڑے ہوئے نقرئی کنگن رہ رہ کر کوند جاتے تھے۔ ان ہی کی چمک میں
گاؤں کے لوہار اور کمہار نے دیکھا کہ ادانتی پور کے پرپیچ اور دشوار گذار راستے
پر کبالا سر جھکائے اور بغل میں کچھ دبائے کھنڈرا کو ساتھ لئے جا رہا ہے۔"

زورِ بیان کے اعتبار سے سفید پھول غالباً اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے۔ اس کے مناظر کی تصویر کشی اور گونگے کبالا کے تاثرات کے بیان میں افسانہ نگار نے بعض جگہ جادوگری کی ہے۔ دیکھئے:۔

"سورج نکلتے ہی کبالا اخروٹ کے درخت کے نیچے آ بیٹھتا۔ اور جوتیاں
بناتے بناتے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دور نیچے راستے پر گذرتی ہوئی
مہ جبینوں کی طرف دیکھتا جو مٹی کی گاگریں کولھوں پر رکھے یا سر پر اٹھائے قطار
باندھے گیت گاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی جاتی تھیں۔۔۔۔ اس وقت کبالا کو
ایسا محسوس ہوتا گویا ان کے پاؤں سے چھو جانے سے راستے کی مٹی کا ہر
ذرّہ کندن بن کر دمک رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور
اس کے دل کے اندھیرے میں ایک سونے کی لکیر سی کھنچ جاتی اور اس کا جی
چاہتا کہ وہ زور زور سے گائے۔ یہاں تک کہ دور نیچے راہ چلتی ہوئی ماہ جبینوں
کے پاؤں رک جائیں اور وہ نازک اندام سرو قد تنیا، ایک ہاتھ گاگر پر رکھے

اور دوسرے ہاتھ سے دھوتی کا پیلا آنچل سنبھالے اس کی طرف تکنے
لگ جائے اور..... چوٹی کے اوپر چھوٹے سے نیلے آسمان میں
اُڑتے ہوئے بادل یکایک تھم جائیں اور اس کا پرسوز گیت سننے کے لئے
اونچے اونچے دیوداروں کے اوپر جھک جائیں ـــــ لیکن جب کبالا
اپنے لب کھولتا تو اس کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل جاتی، کرخت
اور بلند، جسے سن کر آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے نازک مزاج
گگو، سنہوے اور رت گلے پر پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑ جاتے اور کبالا شرمندہ
ہو کر اپنے لب زور سے بھینچ لیتا۔ جیسے انہیں سوت کے ٹانکوں سے
اس نے خود ہی سی دیا ہو۔"

حسین الفاظ اور نازک تاثرات کا ایسا لطیف امتزاج، مصوری اور موسیقی کا ایسا دل آویز اجتماع، کیف اور رس کا ایسا مدھ بھرا جام کون ہے جو اسے دیکھے اور پھر دیکھنے کی آرزو اپنے دل میں نہ پالے، اسے سُنے اور گوش برآواز نہ رہے، اسے چکھے اور بدمست نہ ہو جائے؟

تو یہ ہے کرشن چندر اور اس کا آرٹ.....

آغاز آپ کے سامنے ہے، انجام نامعلوم!

صلاح الدّین احمد

جنّت اور جہنّم

زیبنی کے متعلق میں کیا جانتا ہوں، یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ انسان کی ذہنی کیفیتیں سمندر کے مدوجزر کی طرح دل کے ساحل پر آتی ہیں اور اکثر نہایت ہی لطیف، ناپائدار اور مبہم نقوش چھوڑ جاتی ہیں، اور عموماً یہ مبہم سی تصاویر لہروں کے دوسرے ریلے ہی میں یوں فنا ہو جاتی ہیں کہ پھر کوئی اُن کا نام و نشان بھی نہیں پا سکتا۔ یا پھر نئے نقوش اپنی تزئین اور حسن امتزاج سے نئی جمالیاتی کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے آغوش میں اس ساحل کی ریت کا ہر ذرّہ نگنا اٹھتا ہے "کیا اس سے پہلے بھی زندگی تھی۔ یا یہ نغمۂ حیات کی ایک اضطراری لے ہے"؟

لیکن بعض نقوش اس قدر ناپائدار اور مبہم نہیں ہو
اور وہ ساحلِ حیات پر ایسی تصویریں کھینچ دیتے ہیں
مدّت تک قائم رہتی ہیں۔ ایسی ہی تصویروں میں سے ایک
تصویر زینی کی بھی ہے، اور دراصل ایک ہی نہیں بلکہ تین
کیونکہ جب کبھی مجھے زینی کا خیال آتا ہے تو بیک وقت
اس کی تین تصاویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، تین مختلف
تصاویر، تین مختلف لمحے، نگاہ کے تین مختلف زاویے۔
جس طرح سات رنگوں سے مل کر قوسِ قزح بنتی ہے۔
اسی طرح ان تین تصاویر کی ترتیب سے زینی کی زندگی
کہانی بن جاتی ہے۔ لیکن یہ زندگی قوسِ قزح سے بہ
مختلف ہے، کہیں مختلف!

دیکھنے میں تو زینی قوسِ قزح کی طرح ہی حسین
میں نے جب پہلے پہل اسے دیکھا، تو اُس وقت میں
پُلوں والے شہر کے سب سے خوب صورت پُل امیرا
پر جھکا ہوا جہلم کی سطح پہ تیرتی ہوئی دنیا کا جائزہ
تھا، یوں ہی بے کار سا، آوارہ سا، اُکتایا ہوا، سری
دلچسپیوں کو ایک بے کیف سطحی انداز سے دیکھ رہا

شکاروں کے لال لال پھولوں سے کڑھے ہوئے پردے ایک طرف کو ہٹے ہوئے تھے، اور اُن میں کہیں موٹے موٹے مردوں کے ساتھ پری وش عورتیں سوار تھیں، جن کے چہرے اور جن کے طلائی آویزے دوپہر کی دھوپ میں یکساں طور پر چمک رہے تھے۔ کہیں تنومند، وجیہہ نوجوانوں کے ہمراہ بھتی اور بدشکل عورتیں اپنے بہترین لباس پہنے بیٹھی تھیں، اور اپنی خوش قسمتی پہ نازاں معلوم ہوتی تھیں؛ جو عورت جتنی زیادہ بدصورت تھی وہ اتنا ہی اچھا اور بھڑکیلا لباس پہنے تھی۔ در اصل پردے کی رسم تو ان ہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی، اور ان کے شوہروں کے چہرے کم از کم اس وقت تو اسی خیال کے آئینہ دار تھے۔ بیچارے دوسرے شکاروں میں بیٹھی ہوئی خوب صورت عورتوں کو گھور گھور کر اپنے نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے، اور اُن کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب، میٹھی آوازیں ہنس ہنس کر انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، کم از کم مجھے ان کی آواز بہت شیریں معلوم ہوئی شیریں جیسے کوئل کی کوک، اور آخر کوئل کا رنگ بھی تو

سیاہ ہی ہوتا ہے!

فنکارے خوب صورت اور بدصورت مخلوق سے لدے ہوئے تھے لیکن ان میں زندگی کی حرکت، بےچینی، اضطراب سب کچھ موجود تھا، وہ پانی کی سطح پہ بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ لال لال پردے ہلتے ہوئے دکھائی دیتے۔ بھدی شکلیں، حسین تصویروں میں تبدیل ہو جاتیں، قہقہے۔ اور مانجھیوں کے گیت ایک ہی نغمہ بن جاتے، اور وہ فنکارے دربار ہال کے سامنے اس کے سفید سفید ستونوں کے قریب پہنچ کر شہر وینس کا سا نظارہ پیش کرتے ہوئے ایک موڑ پہ غائب ہو جاتے، لیکن یہ حرکت، یہ زندگی۔ ان لمبے دوم درجے کے ڈونگوں یا ہؤس بوٹوں میں نہ تھی پانی کی سطح پہ چپ چاپ بدنما بطخوں کی طرح تیر رہے۔ ان کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن پردے آویزاں تھے، صر ایک ہؤس بوٹ میں ایک کھڑکی کھلی تھی۔ کھڑکی کے دو طرف دو انگریز عورتیں بیٹھی ہوئی سویٹر بن رہی تھیں، کیا یہ لو سری نگر میں سویٹر بننے کے لئے آتے ہیں، یا میری طرح کے بنگلے کے قریب کھڑے ہو کر محض تماشا دیکھنے کے لئے؟

اور پھر مجھے اس وقت زینی دکھائی دی - جہلم کے
پانی کا ایک ہی ریلا اُسے میرے دل کے ساحل کے قریب
کھینچ لایا، وہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کے کنارے پر کھڑی
کشتی کا رُخ بدل رہی تھی - رُخ بدلنے کا چپّو اس کے
ہاتھ میں تھا، اور چاندی کا ایک "جھمکا" اُس کے کان میں
سی خاموشی نغمے کی گت پر لرزتا ہوا معلوم ہوتا تھا - پھر
سے وہ بجلی کی تیزی کی طرح پُل کے نیچے سے گزر گئی - اور مجھے
نگے کا دوسرا سرا نظر آیا - یہاں ایک لمبی سی ڈانڈ لے
ے گیارہ بارہ سال کا لڑکا ڈونگے کو کھے رہا تھا - اُس کا
ل سرخ و سپید چہرہ اور سر پہ گول منقش ٹوپی بھی پُل
نیچے غائب ہو گئی - اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ
کی دوسری جانب آچکے تھے، وہ ڈونگے کو پچھلے گھاٹ پر
نے کے لئے رُخ بدل رہے تھے، ڈونگے کی سب کھڑکیاں
تھیں اور ان کھڑکیوں کے زرد زرد پردے ہوا میں لہرا
، تھے - میں نے کن پٹیوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ڈونگے
م پڑھا جو دھوپ میں چمکتے ہوئے نیلم کے ٹکڑے کی طرح
ماں نظر آرہا تھا "THE HEAVEN" "جنت" یہ نام غالب

کسی عیش پسند سیاح یا کسی انگریز پادری نے رکھا ہوگا، جنت اب نچلے گھاٹ کے قریب آ رہی تھی، اس کے ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی کے اوپر ایک چوکور بورڈ لٹک رہا تھا "TO LET" جنت کرائے کے لئے خالی تھی۔ میں جنگلے سے ہٹ کر ایک دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ زینی اور چھوٹا لڑکا اب اسے کنارے پر باندھ رہے تھے۔ معاً میرے دل میں ایک خیال آیا، اور میں ایک تیزی سے امیرا کدل کے پل سے گزرتا ہوا نچلے گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

زینی نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر سلام کیا۔ پھر وہ ڈانڈ کا سہارا لئے ایک عجیب جھجک اور ایک عجیب بے باکی کے ساتھ کشتی کے کنارے پر کھڑی ہو گئی، اور چھوٹے لڑکے سے بولی۔ "عزیزا، صاحب کو ہوس بوٹ دکھاؤ۔"

عزیزا ہنستا ہوا اٹھا، وہ یونہی ہنس رہا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے، کشمیری لڑکوں کی طرح، اس کے دانت جو ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کے بغیر ہی غیر معمولی طور پر سفید تھے اس کے سرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے، اس نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بے پروائی۔

ینی کے قدموں میں پھینک دی اور پھر زینی نے جس ملائمت
ر ملاطفت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا ہے۔ اسے کچھ
ں ہی بہتر جانتا ہوں۔ اس کی آنکھیں عزیزا کی اس
صوم شوخی پر ایک دم اس طرح چمک اٹھیں جیسے سحر
وقت ڈل کے خاموش نیلے پانی پر آفتاب طلوع ہو جائے
۔ جب میں عزیزا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا
نہ زینی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہی تھی۔

عزیزا کہنے لگا: "یہ ڈرائنگ روم ہے، یہ اس طرف
ینہ والا میز ہے، یہ لکھنے کا میز۔"

اور میں نے عزیزا سے پوچھا "کیا یہ ہوس بوٹ تمھارا
؟ اور وہ لڑکی کون ہے؟"

"وہ؟" عزیزا نے یونہی سر ہلاتے اور مسکراتے ہوئے
" وہ زینی ہے۔ میری خالہ۔ یہ ہوس بوٹ زینی کے
ند کا ہے، وہ نوکری کی تلاش میں سوپور گیا ہے۔ یہ
الماری میں چینی کے برتن، دو سیٹ، چمچے، پرچیں، یہ کھانی
رتن، دو گیس لیمپ۔"

"اچھا، اچھا، آگے چلو"

"یہ سونے کا کمرہ ہے، وہ دوسرا کمرہ بھی سونے کا ہے، ان میں پانچ پلنگ آسکتے ہیں، میں اور زینی اس کمرے میں رہتے ہیں، وہ چھوٹا سا کمرہ، جو کچن کے قریب ڈونگے کے دوسری طرف ہے۔

"اچھا چلو کچن دکھاؤ!"

سب کچھ دیکھ لیا، اس چھوٹے سے دوم درجے کے ڈونگے کو جسے زینی اور عزیزا فخریہ لہجہ میں اپنا ہوس بوٹ کہتے تھے۔ زینی اور عزیزا کے ہونے والے "صاحب" نے جسے پنجاب میں اس کے سب دوست اس کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے "لگڑ بگڑ یا چرخ" کہتے تھے۔ سب کچھ دیکھ لیا۔ لیکن زینی کو بار بار دیکھ کر بھی اس کے دل کی پیاس نہ بجھی۔

"زینی!" میں نے اپنی پتلون پر سے مٹی کا ایک خیالی ذرہ اڑاتے ہوئے پوچھا "اس ——— زینی، اس ڈونگے کا میرا مطلب ہے اس ہوس بوٹ کا کرایہ کیا ہوگا؟"

زینی نے اپنی باریک آواز میں کہا "کیا صاحب یہیں رہے گا؟!"

"ہاں، ہاں، اسی بوٹ میں"

"تب یہ کرائے کے لئے خالی نہیں"

"ارے ——— "میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ کیوں؟"

عزیزا ہنستے ہوئے بولا "صاحب ہمیں وُلّر جانا ہے۔ دراصل ہمیں سوپور جانا ہے، مگر راستے میں وُلّر آئے گی جھیل وُلّر، اور مانس بل، ہم یہ ڈونگا لے کر سوپور جائیں گے جہاں زبیٰ کا گھر والا گیا ہے، پھر ہم اس کو لے کر واپس آئیں گے اگر صاحب کو وُلّر دیکھنا ہے، تو منظور، ہم سب کچھ دکھائیں گے اور کرایہ بھی تھوڑا ہوگا۔ اگر صاحب کو اِدھر ہی رہنا ہے، تو پھر ہم مجبور ہیں"

میں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا، عزیزا کا ہنستا ہوا معصوم سا چہرہ بہت پُر امید تھا، گویا وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا "چلو صاحب، وُلر دیکھنے چلو صاحب" میں نے زبیٰ کی طرف دیکھا، زبیٰ کا چہرہ آنچل کی اوٹ میں تھا۔ کیا وہ بھی اپنے خاوند سے ملنے کے لئے بے قرار تھی، اور تو! —— اے شاعر مزاج آوارہ سیاح! تو اس خطرناک مثلث کو کیوں پورا کرنا چاہتا ہے؟ ہوس کے غلام! کیا تیرے لئے اس

دنیا میں کوئی اور کام نہیں ؟ کوئی آرزو۔ کوئی مطمح نظر نہیں ؟

لیکن دل کے ساحل پہ اس قسم کی لہریں بہت ہی چھوٹی چھوٹی ہلکی اور لطیف ہوتی ہیں، آئیں اور چلی گئیں، اور ساحل کی ریت اپنے چمکتے ہوئے لاکھوں ذرّوں کے ساتھ بدستور کسی محبوب کی منتظر رہتی ہے !

میں نے آہستہ سے کہا "اچھا، عزیزا، آج شام کو تم اس ہوس بوٹ کو امیرا کدل کے سامنے —— اس گھاٹ پر لے آنا۔ کل ہم ڈل کر چلیں گے "

"بہت اچھا صاحب " عزیزا نے پُرمسرّت لہجہ میں کہا۔ زینی کا چہرہ بدستور آنچل کی اوٹ میں تھا!

(۲)

ہری سنگھ ہائی سٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے دھیان میں ٹھہرا ہوا تھا، راستہ بھر انسانی زندگی کی حماقتوں پہ غور کرتا رہا، حسن کیا ہے ؟ اور انسان بدصورتی سے بھی زیادہ حسن سے کیوں متاثر ہوتا ہے ؟ حسین پھول جب مرجھا جاتا ہے تو اسے آپ پاؤں تلے کیوں روند دیتے ہیں ؟ اور کیوں ایک عورت پانچ بچّے جننے کے

بعد آپ کی تعریفی نگاہوں کی مستحق نہیں رہتی ؟ یہ کیونکر ہوتا ہے کہ ایک تنو مند کسان دن بھر ایمان داری اور صدق دلی سے کام کرتا ہوا اور دن بھر خدا کو یاد کرتا ہوا بھی اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے نان و نفقہ مہیّا نہیں کر سکتا۔ اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے گناہوں اور اوباشیوں کا بارِ گراں لئے ہوئے میدانوں کی تپتی ہوئی فضاؤں کو چھوڑ کر اس دلفریب وادی میں جنّت کے مزے لوٹنے کے لئے آ جاتے ہیں، اور پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں غریب کی جنّت ہتھیا لی وہ اگلی دنیا میں بھی اس کی جنّت نہیں چھین لیں گے ؟ تقدیر؟ تناسخ ؟ رضا؟ اور پھر یہ تو زندگی کی حماقتیں ہیں اِن کے بارے میں کچھ سوچا ہی کیوں جائے ؟ کیا یہی کافی نہیں کہ زینی حسین ہے اور اس کا خاوند سوپور گیا ہوا ہے اور کل ہم اُس کے ڈونگے پر سوار ہو کر وُلر دیکھنے جا رہے ہیں؟

جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو سبھی میری رائے سے متفق نظر آتے تھے، گور بخش اپنی داڑھی کو کلپ لگاتے ہوئے بولا، میں بھی چلوں گا"

بھیّالال بولا: "میرے خیال میں آٹھ دس روز تو گذر ہی جائیں گے، اور آخر اب یہاں سری نگر میں رکھا ہی کیا ہے کیوں سرفراز ؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

محمود بولا: "کیوں بھئی میں بھی چلوں ؟"

اب رہ گئے اندر اور متّل، وہ دونوں بند کی طرف سیر کو گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو انھوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کشمیر آکر زندگی کی حماقتوں پر غور کرنا بنفسہٖ سب سے بڑی حماقت ہے۔ اور اس کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی ٹولہ کی سیر میں باقی احباب کا ساتھ دیں۔

گورنجش نے کہا: "آج رات ہم ڈونگے ہی میں بسر کریں گے۔ سب اسباب لے چلو۔ ہارمونیم۔ طبلہ۔ گراموفون کیمرہ، دوربین، بستر، مٹھائی، انڈے۔ کیک، پھل اور ہاں میں بھول گیا تھا، تم لوگ اپنے لئے حجامت کا سامان بھی لیتے چلو، اور ہاں بھئی سرفراز، تم وہاں سے اس کم بخت ڈونگے والے ہی کو بلا لاتے، اسی سے یہ سامان اٹھوا کر لے جانے

کو کہتے۔"

"کوئی کم بخت آدمی اس ڈونگے کا مالک والک نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی مالک تو ایک لڑکی ہے۔

"لڑکی؟" سب نے یکایک چیخ کر کہا۔

"بس پندرہ یا کہ سولہ کا سن!"

لیکن انھوں نے مجھے شعر پورا نہ کہنے دیا، دوسرا مصرعہ زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر وحشیوں کی طرح پل پڑے، "ابے گاؤدی"، "ابے لگڑ بگڑ یا چرخ" اس کا نام کیا ہے؟" "شکل کیسی ہے؟" "بچہ جی بتاتے ہو یا اپنا گلا دبواؤ گے؟"

ہمیں سری نگر سے چلے ہوئے سات روز ہو چکے تھے اور اب ہم اس دریائی زندگی سے بہت مانوس ہو چکے تھے، دن رات کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے سوا اور کیا کام ہو سکتا تھا، ہاں کبھی کبھی برج کھیلتے اور کبھی کیرم۔ ڈونگا اپنی دھیمی چال سے جہلم کی سطح پر بہتا جا رہا تھا۔ محمود اکثر دوربین لگائے اُن دور کے اور بلند سلسلہ ہائے

کوہ کی طرف دیکھتا رہتا جن کی چوٹیاں گرمیوں میں بھی برف پوش دکھائی دیتی ہیں۔ گورنجش ہارمونیم کے پردوں پر ہاتھ رکھے اپنے گلے سے سریلی تانیں نکالتا اور بھیا لال اپنے دبلے پتلے جسم اور لمبے قد کے ساتھ بار بار ڈونگے کی چھت کو ہاتھ لگا کر ہم کوتاہ قدوں کی تضحیک کر کے اپنی بدنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا ——— اور زینی؟ لیکن زینی کے تو ہم سب پرستار تھے، گو میں اپنا حق سب پر فائق سمجھتا تھا اور یہ بات میں نے اپنے ساتھیوں پر اچھی طرح واضح کر دی تھی، لیکن جلد ہی ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ یہ چڑیا کسی کے جال میں پھنسنے والی نہیں، اس کی ادائیں دل ربا تھیں، اس کے گیت دلکش، اس کی مسکراہٹ دل افروز، لیکن اسے اپنے خاوند سے محبت تھی، اُسے اپنے خاوند پر ناز تھا۔ جو سوپور میں تلاشِ معاش میں مصروف تھا، جب وہ چپو چلاتے چلاتے یکایک ہنس پڑتی تو یہ ہنسی ہم میں سے کسی کے لئے نہ ہوتی غزنیہ کے لئے بھی نہیں، جو اسے اتنا پیارا تھا، پھر کبھی چپو ہاتھ

سے چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی اور پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگ جاتی جدھر سوپور تھا اس وقت گوربخش ایک بے سُرے لہجے میں چلاّ اُٹھتا "دلدار کمنداں والے دا ـــــــ دلدار!"

بھیّالال نے تو پہلے دن ہی زینی کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا۔ "گو شکل و صورت سے تو میں روایتی مجنوں ہوں، لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ لیلیٰ مجھے محبّت کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی، اور اس لیلیٰ پر ہی کیا موقوف ہے دنیا کی کسی لیلیٰ کو بھی میری چاہ نہیں ہو سکتی، اس لیے "اے میری پہاڑی لیلیٰ! "گڈ بائی"۔ لیکن بھیّا لال ہی پر کیا منحصر ہے، قریبًا قریبًا یہی حال ہر ایک کا تھا شروع شروع میں گوربخش نے زینی کو ایک دو دن سریلے عشقیہ گیت سنائے تھے، اور کچن میں بیٹھ کر مچھلیاں بھونتے بھونتے اسے مچھلیوں کی ایک پلیٹ بھی پیش کی تھی، اور کبھی کبھی اندر اور مٹّل پھلوں کے ٹوکروں میں سے سیب اور ناشپاتیاں چرا کر اسے دے دیا کرتے تھے اور ہاں کبھی کبھی کیک کے ٹکڑے بھی

لیکن اب چند دن سے یہ فیاضی بند کر دی گئی تھی، اور اب سب لوگ زینی کو قریبًا بھول گئے تھے۔ اب وہ دن رات کھانا پکانا گانا ناچنا۔ جہلم میں تیرنا اور اسی قسم کے کاموں میں منہمک رہتے تھے، ہر ایک چہرہ بشاش نظر آتا تھا، اور ان سات دنوں کے قلیل عرصہ ہی میں ہر ایک کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا وزن پہلے سے دگنا ہو گیا ہے!

بھیّا لال نے اپنی پتلی کمر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ارے یار میں تو سچ مچ موٹا ہو رہا ہوں، اب یہ پتلون مجھے کمر کے گرد تنگ معلوم ہوتی ہے۔"

اندر نے اپنے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے گال اب پہلے پچکے ہوئے نہیں رہے۔"

منّی بولا "اب میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے چہرے پر سرخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے"

محمود جو اشتراکی خیالات رکھتا تھا طنزیہ لہجہ میں بولا

"ہاں، انقلاب قریب آ رہا ہے!"

. . . .

انقلاب تو خیر ایک دور از کار بات تھی۔ لیکن اس
یں شک نہ تھا، کہ سوپور ضرور قریب آرہا تھا۔ کل ڈوتر اور
پرسوں سوپور، اور پھر شاید زینی کی یہ شوخ ادائیں
ہمیں عمر بھر میسر نہ آسکیں گی، میں کچن کے دروازے
پہ کھڑا ہوکر زینی کی طرف دیکھنے لگا، جو ڈونگے کے
کنارے پہ بیٹھی ہوئی چپّو سے کشتی کا رُخ ٹھیک کر
رہی تھی۔ ڈونگے کے دوسرے سرے پہ کہیں عزیزا پسینے
ں منہ بتر ڈانڈ چلا رہا ہوگا۔" میں نے دل میں سوچا
بے چارہ غریب گیارہ سال کا لڑکا، لیکن پیٹ کے
لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے، کچن کے عقب میں جو کمرہ
تھا۔ وہاں محمود سویا پڑا تھا، اور اس کے ہلکے ہلکے
خراٹوں کی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی کبھی کبھی
ڈائنگ روم سے ہنسی کی ایک بلند چیخ سنائی دیتی، اندر
نے برج کھیلتے وقت بلف سے کام لیا ہوگا۔
زینی نے کہا، "صاحب کل ہم ڈوتر پہنچ جائیں گے۔"
"جھیل ڈوتر کیا بہت خوب صورت ہے؟"

زینی سر ہلاتے ہوئے بولی جی صاحب! جدھر نظر اٹھاؤ، پانی ہی پانی، تیرہ چودہ میل تک، چاروں طرف نیلا پانی اور بیچ میں کہیں کہیں کنول کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے اور سری بٹ ناگ ....."

"سری بٹ ناگ کیا؟"

"بٹ ناگ ولر کا دیوتا ہے، ولر کا بادشاہ۔ وہاں ہر ایک سیاح کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان انگریز، کچھ نذر دینی پڑتی ہے۔"

"اور اگر وہ نہ دے؟"

"تو اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے۔"

"اچھا.... تو کیا جھیل ولر بہت خوب صورت ہے؟"

"صاحب خود دیکھ لیں گے۔"

"تم سے بھی زیادہ خوب صورت؟" میں نے زینی قریب جاکر کہا،

زینی کا چہرہ جو پہلے ایک سیب کے پھول کی طرح اب ایک گلاب کا پھول بن گیا، اس نے شرما کر منہ موڑ لیا۔

میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا، اور زینی کے ہاتھ میں دے دیا، اور جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا "یہ لو اسے سری بٹ ناگ کی نذر کر دینا۔"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر یک لخت زینی چپو چھوڑ کر تن کر کھڑی ہو گئی اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ گلاب کا پھول ایک شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کانپتے ہوئے نوٹ کو دور سے اپنی مٹھی میں مسل ڈالا اور پھر اسے تیزی سے پانی میں پھینک دیا، زینی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نم دار ہو گئی تھیں اور بالوں کی ایک لٹ داہنے رخسار پر تر آئی تھی۔

یہ زینی کی دوسری تصویر ہے جو آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے، میں آج بھی آنکھیں بند کئے چشم تصور سے اسے ایک شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھتے دیکھ سکتا ہوں۔

میں دیر تک کچن کے دروازے کے قریب کھڑا رہا اور پشیمان، اپنی شکست کی زندہ تصویر، نوٹ چکر

کاٹتا ہوا، پانی کی سطح پر بہہ رہا تھا، آخر اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصّہ میں شفق کی لالہ گوں لہریں غائب ہوگئیں اور رات کی سیاہ چادر پر تاروں کی افشاں چن دی گئی۔ ان تاروں کی شوخ ہنسی گویا مجھ سے بار بار کہہ رہی تھی۔ کیوں، کیا تم زینی کو بھی ایک مچھلی سمجھتے تھے، وہ مچھلی جو تمھارے پانچ روپے کے نوٹ کو ایک نعمت غیرمترقبہ سمجھ کر چپ چاپ نگل جاتی، لیکن وہ پانی کی مچھلی نہیں آدم کی اولاد ہے اُسے اپنے بھلے برے کی تمیز ہے، وہ غریب ہے تو کیا؛ وہ تمھارے روپوں کی محتاج نہیں، تم اسے نہیں خرید سکتے، کبھی نہیں خرید سکتے!"

دوسرے دن ہم وُلر کے کنارے پہنچ گئے، اور ہم نے اپنے ڈونگے کو وہاں بندھوایا جہاں دریائے جہلم جھیل میں داخل ہوتا ہے، ——— حدِّ نظر تک، سمندر کی طرح نیلا پانی پھیلا ہوا تھا، اور دور، بہت دور چاروں طرف ایک سلسلہ کوہ ایک نیلگوں دیوار کی طرح نظر آرہا تھا مرغابیوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ جھیل کے اوپر پرواز کر رہے

تھے، چار پانچ کشتیاں جھیل کی سطح پہ بچّوں کی ناؤ کی طرح کم زور اور بے کس سی نظر آرہی تھیں۔ ہوا ساکن تھی، ورنہ اگرچہ ہوا زور کی چل رہی ہوتی، تو اس جھیل میں بیس بیس فٹ کی لہر کا پیدا ہونا مشکل نہ تھا، اور پھر پانی کی ان طوفانی دیواروں کے آگے کشتیاں کہاں محفوظ رہ سکتی تھیں،

لیکن اگرچہ ہم سارا دن ایک کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں گھومتے رہے، ہوا بالکل ساکن رہی اور جھیل کی سطح نیلے سنگ کے شیشے کی طرح بالکل شفاف اور غیر متحرک، ہم نے ری بٹ ناگ دیکھا، یہ ایک بہت بڑا بھنور تھا جو جھیل کے مغربی سمت میں ایک گول دائرہ بناتا ہوا گھوم رہا تھا اور بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ہم نے کشتی کے ملّاحوں کے کہنے پر بھی وتر کے اس بے تاج بادشاہ کو ایک پیسہ تک نذر دینا گوارا نہ کیا۔ اور پھر ہم نے ری بٹ ناگ کا ایک وزیر بھی دیکھا جو ایک چھوٹا سا بھنور تھا، اور پہلے بھنور سے قریباً چار میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہاں البتہ گورنجش نے جو تیرنا کم جانتا تھا۔ ایک دو

ناشپاتیاں وزیرہ کی نذر کیں جو خدا جانے کتنے دنوں سے بھوکا تھا۔ کیونکہ ملاحوں کے کہنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ آخری حادثہ آج سے دو مہینہ پیشتر تین انگریزوں کو پیش آیا تھا جو اس جھیل میں کشتی چلاتے چلاتے اُن طوفانی لہروں کا شکار ہو گئے۔ جو فی الفور ایک تیز جھکڑ کے چلنے سے پیدا ہو گئی تھیں۔

سہ پہر کے بعد جب ہم جھیل کی سیر سے لوٹے تو زینی اور عزیزا دونوں کو زار و قطار روتے ہوئے پایا، پوچھنے پر پتہ چلا کہ زینی کا خاوند سوپور سے پنجاب چلا گیا ہے۔ روزگار کی تلاش میں۔ ایک آدمی سوپور سے آیا تھا، وہ ادھر سے گذر رہا تھا اور اس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہو ہم نے زینی اور عزیزا کو جہاں تک ہو سکا تسلی دینے کوشش کی لیکن اُن کے آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے وہ اپنے آپ کو اب بالکل بے یار و مددگار پاتے تھے، بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے۔

طبیعت بہت عرصہ تک کبیدہ رہی، یہ لوگ کتنے بیو ہیں۔ رونے سے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر کیا اس بے وق

کشمیری کو اس کے اپنے وطن میں کوئی کام نہیں مل سکتا
تا؟ پنجاب میں اسے کیا قارون کا خزانہ مل جائے گا؟
مدرسے؟ بے وقوف غریب، ان میں عقل تو بالکل نہیں ہوتی
ض بوجھ اٹھانا جانتے ہیں، خچروں کی طرح، انھیں انسان
جھنا ہی حماقت ہے۔ ان کے ساتھ خچروں کا سا ہی سلوک
نا چاہیئے، غریب لوگ غریب ہی رہیں تو ٹھیک طرح کام
تے ہیں، اگر انھیں پیٹ بھر کر کھانا ملنے لگے تو اکڑ
تے ہیں، غرضکہ طبیعت بہت منغّض رہی، ہم سب لوگ
نے آپ کو تصور وار سمجھ رہے تھے، اور یہ احساس ہمیشہ
یف دہ ہوتا ہے، آخر کھانا کھانے کے بعد بھیّا لال کے
نوں سے طبیعت کسی قدر بہلی، گوربخش نے گراموفون پہ
دلکش ریکارڈ سنائے اور ہماری محفل پھر قہقہوں سے
نج اٹھی۔

(۳)

دس بجے کے قریب جب "برج" شروع کی گئی، تو میں
سر کا بہانہ کرکے اٹھ آیا، دراصل میں برج کھیلنا نہیں
نا تھا، پہلے میں سونے کے کمرے میں گیا، پھر میں نے

کچن میں جا کر پانی کا ایک گلاس پیا۔ لیکن طبیعت میں بے کلی بدستور موجود تھی، میں کچن سے ہوتا ہوا باہر ڈونگے کے کھلے فرش پر آگیا۔

زینی ہاتھ میں چپّو لئے ہوئے جھیل کے نیلے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی تھی، اور اس کے قدموں میں عزیزا لیٹا ہوا تھا، نہیں، وہ رو رو کر سو گیا تھا، اس کی پلکوں پر آنسو ابھی تک چمک رہے تھے اس کے لبوں سے اب بھی کبھی کبھی کوئی سینے میں دبی ہوئی سسکی نکل جاتی تھی۔

اور زینی؟ ——— وہ کیا سوچ رہی تھی؟ ———

کیا اس کی نظر جھیل کی وسعتوں سے پرے پنجاب کے میدانوں تک پہنچ رہی تھی، جہاں اس ظالم پردیس میں شاید کسی لکڑی اور کوئلے کی دکان کے آگے اس کا خاوند لیٹا ہوا تھا، دن بھر کی محنت مشقت سے چُور ——— ایک تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپ رہا تھا۔ زینی کا چہرہ اُداس تھا، اس کی آنکھیں جیسے خلا میں کچھ دیکھ رہی ہوں۔

"زینی!" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"مجھے بہت افسوس ہے زینی!"

"زینی" کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا۔

"زینی۔ تم گھبراؤ نہیں" میں نے آہستہ سے کہا۔

"صاحب، اب ہم کیا کریں گے؟" زینی نے گلوگیر لہجہ میں کہا "اب ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں ——— ایک خاوند تھا۔ وہ پردیس چلا گیا"

"عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے .....

"میں عورت ذات ہوں .....

"ہائے اب کیا ہوگا؟"

زینی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں، میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

"کیوں گھبراتی ہو، زینی، تمہارا خاوند ضرور پردیس سے واپس آجائے گا۔ اور ———"

زینی نے روتے ہوئے کہا "صاحب میں مرجاؤں گی۔ اور چھوٹا عزیزا بھی بھوکا مرجائے گا۔ ہائے اس نے ہمیں دھوکا دیا!"

"مت گھبراؤ زینی، میں تمہارے لئے ..... میرا مطلب ہے میں

تمھاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں، ہاں تم روتی کیوں ہو، میری اچھی زینی، مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، بے اندازہ محبت۔ میں تمھارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ......"

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا ایک نوٹ تھما دیا۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے شعلے کی ایک بلند لپک پیدا ہوتی ہے اسی طرح زینی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی بجھ گئی، تیل ختم ہو چکا تھا اور پھر غریبوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہی کہاں ہے۔ زینی ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح میرے آغوش میں گر پڑی اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو میرے بازوؤں میں چھپا لیا ——— اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔"

چاند کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ستارے نادم تھے، وہ جہلم کی سطح پر باسی پھولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا کنول کے پتوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آہیں بھر رہی تھی کائنات کا ہر ذرہ سر جھکا کر اداس لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ تم نے ہمیں خرید لیا،

صرف ڈرائنگ روم سے گوربخش کے گانے کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی، وہ جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است ہمین است وہمین است

End is not so good

بے رنگ و بو

سکھ دُکان دار نے جو آٹا نون تیل بیچتا تھا، آہستہ سے کہا: "میرے مکان میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے، آپ خود چل کر دیکھ لیجئے، کرایہ بھی کم ہے۔ صرف نو روپیہ ماہانہ میں خود آپ کے ساتھ گلی میں چلتا ہوں۔"

سکھ دُکان دار نے سائیکلوں کی دُکان کے مستری کو آواز دی "او رحمو! او رحمو! ذرا میری دکان کا خیال رکھنا"

"کوئی فکر نہ کرو سردار صاحب"

سکھ دُکان دار جہاں رہتا تھا وہ چھوٹا سا مکان تھا ایک ہی منزل، ایک ہی نہانے کا کمرہ، سیڑھیوں کے قریب ایک چھوٹا سا تنگ کمرہ خالی تھا، اور اس کے ساتھ

ہی اندر کی طرف کھلتا ہوا ایک چھوٹا سا آنگن۔

"بس، اس چھوٹی سی جگہ کے لئے تو روپیہ ماہانہ کرایہ"

سکھ دکان دار نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "تو اور کیا، ہم بھی تو روپیہ ہی دیتے ہیں، بجلی، پانی کے نل کا کرایہ ملا کر بارہ روپے ہو جاتے ہیں، مہینہ بھر میں بمشکل تیس پینتیس روپیہ کماتا ہوں، بارہ روپیہ مالک مکان کو دے دیتا ہوں۔ آٹھ دس روپیہ حکیم صاحب کی نذر کرتا ہوں، آپ جانتے ہیں، بیوی بچوں والے گھر میں آٹھ دس روپے کچھ زیادہ نہیں، باقی ..... باقی ..... مشکل سے گزر ہوتی ہے"

سکھ دکان دار کی زرد رُو بیوی انگنی پر ڈھلے ہوئے فراک لٹکانے کو نکلی۔ ایک بچہ اس کی دھوتی کا گوشہ پکڑے روئے جاتا تھا۔ ایک بچہ وہ گود میں اٹھائے تھی جو اپنے ننھے ہاتھوں میں کھانڈ کے بتاشے پکڑے ہوئے تھا ایک بچہ اُس کے پیٹ میں تھا،

سکھ دکان دار نے کھانستے ہوئے کہا "تو یہ گھر — آپ —— آپ کو پسند نہیں؟"

"جگہ تو اچھی ہے، لیکن ذرا ——— اس کمرے میں اندھیرا بہت ہے۔"

سکھ دکان دار کی کھانسی تیز تر ہوتی گئی، آخر رک رک کر بولا، "ہاں..... اندھیرا..... اندھیرا، نَو روپے ماہانہ میں اندھیرا نہ ملے گا تو اور کیا روشنی مل سکتی ہے؟"

یہ گلی پکی تھی، صاف ستھری، سہ منزلہ مکان، دہرے دروازے، مچھروں اور مکھیوں کو روکنے کے لئے۔ جگہ جگہ قہقہوں کی آوازیں، گراموفون کے ریکارڈ، ہارمونیم کی صدائیں، ایک مکان دیکھا، بہت بڑا مکان سرخ سیمنٹ کا فرش، تین چار کرایہ دار پہلے ہی سے رہتے تھے، صرف ایک حصہ جو دو کمروں پر مشتمل تھا خالی تھا۔ کرایہ پندرہ روپے۔

مجھ سے کسی نے کہا، "مالک مکان عقب کی گلی میں رہتے ہیں، آپ اُن سے معاملہ طے کر لیجئے۔"

عقب کی گلی کے آخری کونے پر جنوب کی طرف اُنکا مکان تھا، گھنٹی بجائی تو ہنستے ہوئے باہر نکلے۔

"نمستے!"

"جی، نمستے، آپ اس (ہاتھ سے اشارہ کرکے) کمرے میں تشریف رکھئے، میں ابھی کھانا ختم کرکے آتا ہوں، بس میں ایک منٹ میں آجاؤں گا، مجھے دفتر بھی جانا ہے۔"

دوسرے کمرے میں ایک تنگ پرانی وضع کے صوفے پہ جس پر نیلی چھینٹ کا غلاف چڑھا ہوا تھا، بابو صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔

"مجھے زکام ہے، معاف کیجئے گا۔ میں اٹھ نہیں سکتی" مالکہ مکان نے لیٹے لیٹے اور کشمیری شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے، کہا۔

میں نے مسکرا کر کہا "کوئی حرج نہیں، مجھے بھی زکام ہے"

ہم دونوں ہنسنے لگے، بابو صاحب کمرے میں داخل ہوئے ہمیں ہنستے دیکھ کر ان کے منہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"آپ نے مکان دیکھ لیا؟ پسند ہے؟" اُن کے لہجہ میں خفیف سی درشتی تھی۔

"دیکھ لیا۔ پسند ہے!"

"کرایہ ہر مہینہ ہم پیشگی لے لیتے ہیں"

"اچھی عادت ہے"

لیکن "بابو صاحب" میری بات پر ہنسے نہیں۔ بولے کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اکیلے تو نہ ہوں گے، آپ کے ساتھ عورتیں ہوں گی؟ اور بچے بھی، دیکھئے نا یہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں"

وہ ان دو فقروں میں اپنی معاشرت کی پوری داستان کہہ گیا "یہاں" جس مرد کے پاس عورت نہیں اس کی نہ تو مکتی ہوسکتی ہے اور نہ اسے کوئی مکان کرایہ پر مل سکتا ہے، اور جس عورت کے پاس بچے نہیں اُس کا خاوند دوسرا بیاہ کرلیتا ہے، اور اگر دوسری عورت بھی بچے نہ جنے، تو تیسرا بیاہ.....

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

بابو نے اظہار افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "معاف کیجئے گا، یہ بہو بیٹوں والا محلہ ہے"

بابو کی بیوی نے منہ دوسری طرف پھیرلیا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا، دروازے کے قریب ایک جوان لڑکی بغل میں کتابیں لئے کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر اُس کے گال

تمتما گئے ، اونچی آواز میں بولی "وے منڈو ، جلدی کر کالج دیر ہوگئی "

"آیا بی بی جی" نوکر ہنستا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا ، کوئی سولہ سترہ برس کا ہوگا ، بھیگی بھیگی مسیں سڈول اعضاء۔

یہاں نئے مکان بن رہے تھے ، ابھی بہت سی جگہ خالی تھی ، یہاں ریت اُڑ رہی تھی ، اور شور مچاتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر مٹی پھینک رہے تھے ۔ ننھی منّی لڑکیاں ریت پر لٹوؤں کی طرح چلنے کی کوشش کر رہی تھیں ، یہ ایک لمبی رسی پر کودنے کی کوشش میں مشغول تھیں ، بجھے ہوئے چنے بیچنے والا یاس انگیز نگاہوں سے بچوں کی طرف دیکھتا ہوا گزر رہا تھا ، اس رتیلے میدان سے پرے دور سا ایک مکان پر موٹے حروف میں لکھا تھا "کرایہ کے لئے خالی ہے"

دروازہ کھلا تھا ، ایک چھوٹا سا دالان ، اس کے آگے کا آنگن ، جس میں پانی کے نل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بدصو

فربہ اندام عورت نہا رہی تھی، بغیر کسی جھجک کے بولی "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں؟"

میں نے دل میں کہا "اور کیا تمہیں دیکھنے آیا ہوں؟" جیسے اُس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو، بولی "اچھا آپ ذرا دالان میں ٹھہریئے۔ میں بھی آتی ہوں۔"

وہ ایک سفید دھوتی پہنے ہوئے آئی، یہ سونے کا کمرہ، یہ بیٹھک، یہ ایک اور کمرہ، یہ بھی ایک کمرہ ہے۔ یہ رسوئی ہے، ذرا ناصاف ہے، لیکن کل تک بالکل ——— (سر ہلا کر) ہو جائے گی۔ کرایہ بیس روپے، ہم پیشگی لیتے ہیں اچھے کرایہ داروں کو دیتے ہیں۔ دوسری منزل میں ایک رائے صاحب کے "گھر والے" رہتے ہیں، ان کی تین لڑکیاں ہیں، کالج میں پڑھتی ہیں، تیسری منزل میں ایک پروفیسر صاحب اور اُن کی بیوی اور بچے ....."

میں نے پوچھا "اور تیسری منزل سے اوپر؟"

وہ حیران ہو کر بولی "تیسری منزل سے اوپر؟ ——— اس سے اوپر چھت ہے، سونے کے لئے کھلی جگہ، اور ایک طرف رفع حاجات کے لئے تین کمرے۔"

"ہوں!" میں نے کچن کے فرش کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ فرش ذرا ناصاف ہے، کل تک (سر ہلا کر) ——" پھر میری طرف دیکھ کر بولی، "آپ شادی شدہ ہیں نا؟"

"نہیں، لیکن میرے ساتھ میری خالہ ہوں گی، اور خالہ کی لڑکی، اور خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں"

"اوہ، اچھا —— پھر تو ٹھیک ہے، لیکن کرایہ پیشگی دینا ہوگا، کم از کم ایک دو مہینوں کے لئے، کئی کرایہ دار بغیر کرایہ ادا کئے رخصت ہوجاتے ہیں"

"ہاں، بہن تمھیں ابھی پچھلے مہینے ہی آٹھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا"

اب یہ ایک نوجوان عورت چپکے سے کہیں سے نکل آئی تھی، اچھے نقش تھے، لیکن چہرہ کچھ اترا ہوا کچھ اداس سا، بڑی بڑی آنکھیں، لیکن ملول، رنجیدہ، لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، لیکن پھیکی، تاسف انگیز، گویا کہہ رہی تھی: اس سے کیا فائدہ، وہ دن بھر دفتر میں کلرکی کرتے ہیں۔ اور

میں لبوں پر سُرخی لگا کر برتن مانجتی ہوں، آخر اس زندگی سے کیا فائدہ، وہ شام کو تھکے ماندے آتے ہیں، اور پھر دفتر کے کام میں مشغول ہوجاتے ہیں، اور رات کو —— میرے لبوں کی سُرخی دیکھتا ہی کون ہے؟ ہائے، یہ زندگی کس قدر پھیکی اور بے مزہ ہے۔

"یہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں" مالکہ مکان نے مجھے بتایا، ان کے — بجلی کے دفتر میں نوکر ہیں"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "جی، بہت اچھا، نمستے، جی"

کلرک کی بیوی نے خوش ہو کر کہا "آپ —— یہ مکان کرایہ پر لے رہے ہیں"

جی، سوچ رہا ہوں، میرے ساتھ خالہ ہوں گی، خالہ کی لڑکی، خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں۔ اور ...."

"تو ہرج ہی کیا ہے؟" اس نے خود بخود ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم سب بہنیں مِل جُل کر گزارہ کرلیں گی۔ گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے نا، اور پھر یہ بڑا اچھا مکان ہے" اس نے کچن کے فرش کو پاؤں سے بجاتے ہوئے کہا۔

"یہ فرش ذرا ناصاف ہے" بدصورت فربہ اندام عورت

ایک کل کی طرح بول اٹھی " کل تک (سر ہلا کر) ــــــــ"

میں آہستہ آہستہ باہر دالان کی طرف مڑنے لگا نوجوان عورت کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم یہ مکان لے لیتے، مجھے تمھاری محبت تو درکار نہ تھی، اور میں اس قسم کی باتوں کو پسند بھی نہیں کرتی، لیکن یوں ہی دل بہلا رہتا۔ وہ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں، صبح سے لے کر شام تک۔ تم کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیا کرتے اور میرے لبوں کی سُرخی چمک اٹھتی، کیا ہی اچھا ہوتا، افسوس یہ زندگی کتنی پھیکی اور بے رنگ و بو ہے "

"میں کل تک آپ کو پتہ دوں گا، نمستے"

"نمستے!" دونوں عورتوں نے کہا۔

رتیلے میدان میں ایک گوری رنگت کا مزدور لکڑیاں چیر رہا تھا، کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ، مجھے گذرتے دیکھ کر رُک گیا،

"سلام صاحب"

"سلام! کہاں کے رہنے والے ہو، کشمیری ہو۔"

"نہیں صاحب کلوٗ کا گدی ہوں"

گورا رنگ تنے ہوئے پٹھے۔ بہت میلی نکر۔ پھٹی ہوئی قمیص، کشادہ چھاتی اور ہاتھ میں ایک مضبوط کلھاڑی۔

"کُلّو، کُلّو؟"

"جی سرکار"

"بیوی ہے؟"

گدّی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "جی سرکار" بیوی کے نام پر ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، کیا ہوا گر وہ غلام ہے کم از کم اُس کا بھی تو ایک غلام ہے!

گدّی اپنی خوش قسمتی پر نازاں مسکرا رہا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے میلے دانت سرخ مسوڑھوں میں نقلی طور پر جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"بچے" بھی ہوں گے؟"

"جی سرکار ایک لڑکا ہے۔ ننھا سا (ہاتھ سے اشارہ کرکے) اتنا سا"

انھیں بھی ساتھ لائے ہو؟"

گدی کی مسکراہٹ جیسے کسی نے پاؤں تلے مسل دی ہو، اُس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا، بولا "صاحب،

کوئی کام دیجئے میں لکڑیاں خوب چیرتا ہوں"

"ایک من کا کیا لیتے ہو؟"

"ایک آنہ"

"ایک آنہ؟ صرف ایک آنہ؟ ارے ——— صرف ایک آنہ؟! آدھے دن کی کمائی"

"سرکار لوگ ایک آنہ بھی نہیں دیتے"

"تم واپس کلو کب جاؤ گے؟"

لکڑی چیرنے والا ریت پر بیٹھ گیا اور حقہ پینے لگا شاید وہ دھوئیں کے حلقوں میں کلو کے سرسبز مرغزار، برفانی چوٹیاں کالی سلیٹ کی چھتوں والے گاؤں اور اپنی بیوی اور ننھے بچے کی تصاویر دیکھ رہا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا۔ لکڑہارے نے یاس انگیز لہجہ میں کہا

"صاحب، کوئی کام بتائیے"

شام کو میں پھر اپنے سرائے نما ہوسٹل کے دروازے پر واپس پہنچ گیا، قید خانے کی طرح تنگ کمروں کی قطاریں، بھنی ہوئی پیاز کی بو بھرے سے آنگن میں بے ترتیبی سے بچھے

ہوئے بنچ، آٹھ دس لڑکوں کے مجمع میں راج ہنس چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا "ہم انقلاب چاہتے ہیں انقلاب، بورژوا عمومی انقلاب اور پھر اشتراکی انقلاب، اور پھر خالص سو فیصدی مارکسی انقلاب، ہم ایک نئے تمدّن، ایک نئی تہذیب، ایک نئی معاشرت کی بنا پر ایک نئے انسان کی تخلیق چاہتے ہیں ہم ..... " بیچارہ راج ہنس۔

مطبخ کا ملازم میرے قریب سے گزر گیا۔

میں پکارا" او ویٹے! آج کیا پکا ہے؟"

ساگ، دال، اور کالشی پھل"

۹۷ نمبر میں رہنے والا برہمن لڑکا رام نام کی دھوتی پہنے باتھ روم میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بستر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

راج ہنس اپنی پتلی آواز میں اب تک چلّا رہا تھا" ہم اس استعماری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے، اسے پیس کر دھر دیں گے، اس کے پرخچے ....."

بھیّا لال کمرے میں داخل ہوا اس نے اداس لہجہ میں پوچھا" تم نے مکان لے لیا؟ اب تم ہمیں چھوڑ کر چلے

جاؤ گے ؟ اپنے سب رفیقوں کو ! "

میں نے جواب دیا " میرے لئے یہ سرائے ہی بہتر ہے "

آنسوؤں والی

ہم دونوں تریٹ کے ڈاک بنگلے میں آرام کرسیوں پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ آتشدان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں اور بند دریچے کے شیشوں میں سے میں برف کے اُن بڑے بڑے سفید گالوں کو دیکھ سکتا تھا جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت تھے اور نہایت خاموشی سے دریائے جہلم میں گر رہے تھے۔ جہلم میں پانی ہر لحظہ بڑھ رہا تھا، دریا کے کناروں پر درخت برف کا سفید لبادہ اوڑھے چپ چاپ کھڑے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب خامشی، ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید ہم کسی پریوں کے مُلک میں آگئے

میرا ساتھی جو انجنیر تھا یکایک آرام کرسی پر اُٹھ بیٹھ
اور میری طرف جُھک کر کہنے لگا۔ کیوں دوست، کیا تمھیں
جادو، سحر و افسوں اور اس قسم کی باتوں پر یقین ہے ؟
میں نے خوابیدہ انداز میں سر ہلا دیا، انجنیر کا چہرہ
بھولے بسرے مگر پُر مسرت ایام کی یاد سے چمک اٹھا
اس نے ایک سگار سلگا لیا اور کہنے لگا، میں تمھیں ایک
کہانی سنانا چاہتا ہوں۔
ایک دفعہ مجھے سہرہ اور گاٹیاں کے درمیان جموں
علاقے کی طرف، ایک خراب اور کچی سڑک کا معائنہ کر
کے لئے جانا پڑا، یہ سڑک پہاڑوں کو کاٹ کر نئی نئی بچھا
گئی تھی اور مجھے جلد از جلد معائنہ کر کے اس کے متعلق
افسروں کو مطلع کرنا تھا کہ آیا یہ سڑک خشک موسم
موٹروں کی آمد و رفت کے لئے موزوں ثابت ہو سکے گ
نہیں۔ افسر لوگ بھی اس سڑک کے لئے بہت بے قر
نظر آتے تھے، کیوں کہ یہی وہ سڑک تھی جو گاٹیاں کی خام
اور پرسکون وادی کو باہر کی دنیا اور اس کی تہذیب
ملا رہی تھی۔

یہ سڑک کوئی ایک سو ستر میل لمبی ہوگی اور سہرہ سے گاٹیاں تک جاتی تھی، میں نے اپنا معائنہ سہرہ سے شروع کیا۔ سہرہ ایک خوش نما جگہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی گول گول پہاڑیاں، چوٹیوں پر کہیں صنوبر کے درخت آسمان کی شفاف اور نیلی سطح پر سیاہ سائے بناتے ہوئے، پہاڑیوں سے نیچے اتر کر ایک سبز اور شاداب سطح مرتفع اور اس پر چند ایک بھوری بھوری جھونپڑیاں جو آفتاب کی کرنوں میں کندن کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہاں سہرہ واقعی ایک اچھی جگہ تھی اور میں نے اُسے بہت پسند کیا، سوائے سہرہ کی چنگی کے جہاں کے افسر مجھے نہیں جانتے تھے، اس لئے اُنھوں نے مجھے دق کرنا ہی مناسب سمجھا، ایک محال دار مجھ سے کہنے لگا صاحب آپ کے اِس ہیٹ پر بھی محصول لگے گا۔ میں نے کہا "بھئی یہ تو پہننے کی چیز ہے"، وہ بولا "ہاں ہے تو یہی لیکن بالکل نئی نظر آتی ہے، در اصل چنگی کے افسر پہننے کی چیز اسے سمجھتے ہیں، جو نئی نہ دکھائی دے۔ نہ دھلائی گئی ہو، بلکہ اچھی خاصی گندی اور ناصاف ہو، محصول صرف اسی صورت میں معاف ہوسکتا ہے۔

خیر ہم سہرہ سے کوئی دس بجے کے قریب آگے چلے اب ہمارے سامنے وہ سڑک تھی جو پیچ در پیچ بل کھاتی ہوئی نئے اور اجنبی علاقوں میں سے گزرتی تھی، مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میری کار بھی پہلی مرتبہ اس علاقے میں داخل ہو رہی تھی، اور اس سے مجھے یک گونہ مسرت حاصل ہوئی میں نے شوفر سے کہا کہ گاڑی آہستہ آہستہ چلائے کیونکہ اوّل تو مجھے معائنہ کرنا تھا، پھر سڑک بھی اکثر مقامات پر بہت تنگ تھی، کہیں کہیں کناروں پہ گہری کھائیاں آجاتی تھیں، جن کی طرف دیکھنے سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے اور اکثر موڑ بہت غلط طریق پر کٹے ہوئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ میلوں ہی آگے، سڑک کا معائنہ کرتے ہوئے، قدرت کی دلفریبیوں کی بہار دیکھتے ہوئے۔ دُور اور آسمان میں چیلیں پر تولے ہوئے گھوم رہی تھیں نیچے زمین پر لمبی لمبی کھیتیاں پہاڑوں کے دامن سے شروع ہوئیں اور پھر کسی پرانے قلعے کی سیڑھیوں کی طرح اوپر ہی اوپر چڑھتی چلی جاتیں۔ کبھی کبھی کوئی درخت اپنے، سُرخ سُرخ پھولوں کی شمعیں لٹکائے ہماری موٹر کے قریب سے دوڑتا

گزر جاتا، ایک جگہ ہمیں ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کرنا پڑا جہاں کم بخت سب انجینئر پُل تو کیا ایک DIVERTION تک بنانا بھی بھول گیا تھا۔ ہم نے اس چھوٹی سی شور مچاتی ہوئی ندی کو کار کی پوری رفتار سے عبور کیا۔ پانی میں سے گزرتے وقت انجن سے نغمے نکلنے لگے اور گاڑی کے پہیئے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر ناچتے ہوئے گزر گئے موسم خزاں کا تھا، لیکن یہاں کی خزاں بھی کتنی حسین تھی، کشمیر میں گاٹیاں سے زیادہ خوب صورت وادی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ میں نے خزاں میں بہار کے گیت گائے میں نے اپنے شوفر کو گاڑی اچھی طرح چلانے پر مبارکباد دی، میں نے ——— یکایک ایک دھچکا سا لگا، جس سے ساری کار کانپ اٹھی، پھر ایک اور دھچکا، اور اب کار وہیں کی وہیں کھڑی ہوگئی، خاموش اور چپ چاپ، صرف انجن ہی ایک بچھڑے ہوئے بھیڑ کے بچے کی طرح بلبلا رہا تھا۔

ہم کار سے اُترے، میں اور میرا ہوشیار ڈرائیور، ایک ہٹتی ہوئی نگاہ سے ہم نے دیکھ لیا کہ کار کو کیا حادثہ

پیش آیا تھا، چپ چاپ۔ یہ کم بخت کچی سڑک درمیان میں
سے بیٹھ گئی تھی اور کار کے پچھلے بائیں پہیے کو اپنی جگہ
سے ہلا گئی تھی، میں نے ڈرائیور سے کہا، ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ آج ہمیں یہیں سردی میں رات بھر ٹھٹھرنا ہوگا
کہہ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور اسی وقت مجھ پر
احساس طاری ہوا جسے آپ سحر یا جادو یا افسوں، جو
چاہے کہہ کر پکار سکتے ہیں۔

یہ ایک تنگ وادی تھی جس کے دونوں طرف
دائرہ بناتے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے
وادی کے عین درمیان پہاڑوں کو چیر کر، ایک چھوٹی سی
بہ رہی تھی۔ اس کا پانی ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعو
میں ایک سونے کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا ہمارے با
قریب ہی دیودار اور شاہ بلوط کے درخت کھڑے تھے
خاموش، چپ چاپ، جنگل کے سپاہی جو شاید عشق و محب
کے وہ حیرت ناک افسانے سُن رہے تھے جنھیں مغربی
دور دور کے ملکوں سے اڑا کر لائی تھیں، پرے جنگل۔
قریب ایک خوب صورت گھر تھا، چکنی مٹی کا بنا ہوا

سپید کھریا سے لپا ہوا، اس کے قریب ہی نیچے سڑک کی طرف، ایک عالی شان چنار اپنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ جس کے گھنے سائے میں ایک ٹھنڈا چشمہ گنگنا رہا تھا۔

اس حسین منظر نے مجھ پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری کردی، اور میں وہیں سڑک کے درمیان کھڑا رہ گیا پھر یکایک ڈرائیور کے یہ تلخ الفاظ میرے کانوں میں گونج اٹھے،

"صاحب افسوس ہے، مگر ہم آج آگے نہیں جا سکیں گے"

میں نے یہ سن کر منہ موڑ لیا اور چشمہ کی طرف چل پڑا چشمے کا پانی بہت ٹھنڈا اور صاف تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا، اور خوب سیر ہوکر پیا، اس کی جاں بخش تازگی نے اس درد کو بھی دور کردیا جو سفر کی تکان کی وجہ سے میری کن پٹیوں میں پیدا ہوگیا تھا۔ "پانی ٹھنڈا ہے راہی"؟ ایک نازک آواز آئی۔

میں نے نگاہ اٹھاکر دیکھا، ایک عورت تھی جو اپنے داہنے بازو اور کمر کے درمیان ایک مٹی کی ٹھلیا تھامے تھی، اس طرح جیسے کوئی ماں اپنے ننھے بچے کو تھامے ہوئے ہو،

وہ کسی قسم کی آہٹ پیدا کئے بغیر ایک وحشی ہرنی کی طرح، یہاں چشمے کے کنارے پہنچ گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی ایک ہرنی کی سی وحشت اور نرمی پائی جاتی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا، اور تعظیم کے طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا، "جی ہاں پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے ایسا اچھا چشمہ تو میں نے اس علاقے میں کہیں نہیں دیکھا

اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولی "تم مجھے اس علاقے کے رہنے والے معلوم نہیں ہو۔ میں نے مسکین لہجے میں کہا "کاش کہ ایسا ہوتا"

اس کے پتلے پتلے لبوں پر ایک لرزش سی پیدا ہو کہنے لگی، "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جو اس جنگل کا رہنے والا نہیں ہے، وہ اس جنگل کا رہنے والا کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا اور اس کے نازک ٹخنو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ننگے پاؤں کی طرف، بلاشہ میں اس جنگل کا رہنے والا نہیں تھا۔

وہ کچھ عرصہ خاموش رہی، پھر اس نے نیچے سڑ

کھڑی ہوئی کار دیکھ لی ، "وہ کیا ہے ، کیا یہ وہی چیز تو نہیں جس کے متعلق میرے بابا نے کہا تھا کہ ایک دن یہاں آئے گی اور اس سب علاقے پر قبضہ کرلے گی ؟"

میں نے وحشی ہرنی کو سمجھانے کی کوشش کی ۔

جب وہ میری باتیں سُن چکی ، تو سر ہلا کر کہنے لگی ، اوُں ہوں ، یہ کوئی اچھی چیز نہیں ، ایک گھوڑا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے ، مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بُرے دن آرہے ہیں ۔

یہ کہہ کر وہ چشمے کے کنارے بیٹھ گئی ، اس نے مٹی کی ٹھلیا کو چشمے میں پھینک دیا اور اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اُسے منھے منھے ہچکولے دینے لگی ، جیسے کسی کھلونے سے کھیل رہی ہو ، اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہوگئیں ، جیسے کوئی عجیب سا سپنا دیکھ رہی ہو ، وہ کیا سوچ رہی تھی جنگل کی حسین شاعرہ ، جب وہ اس طرح چشمے کے کنارے اپنے خیالوں میں مست . ٹھلیا کو اپنی انگلیوں میں تھامے سوچ ہی تھی ، تو یکایک سورج کی آخری کرنیں اُس کے چہرے پر یں ، اُن کندنی کرنوں کے جھلملاتے ہوئے ارغوانی ہالے نے

اس کے چہرے کو اور بھی حسین اور پُر اسرار بنا دیا۔ اور یکایک مجھے احساس ہوا، کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی، بلکہ خود جنگل کی دیوی تھی، جسے ایک حقیر انسان نے دنیائے تہذیب سے بہت دور، ایک خاموش جنگل میں ایک پُر اسرار وادی میں، ایک نیلے چشمے کے قریب بیٹھے دیکھ لیا تھا، ہاں وہ جنگل کی دیوی ہی تو تھی، خوب صورت، پُر اسرار، وحشی گم نام، اور معصوم!

ٹھلیا دیر تک چشمے میں ناچتی اور گنگناتی رہی اور آخر کار پانی سے بھر گئی، پھر یکایک اس کی مالکہ بھی اپنی خوابوں کی دنیا سے اس غیر دلچسپ اور پھیکی دنیا میں لوٹ آئی۔

میں نے اس پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "نیرا" یہ کہہ کر اس نے نگاہیں نیچی کرلیں، اور ایک ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر دوڑ گئی

اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میں نے اس سے کہا، آپ کا نام تو بہت اچھا ہے۔ نیرا نیرا، یعنی آنسوؤں والی، گو میں آپ میں رونے کی کوئی بھی کیفیت

نہیں دیکھتا، سوائے آپ کی آنکھوں میں جن کی ملائمت اور نرمی کسی ہرنی کی آنکھوں کی یاد دلاتی ہے۔

اس پر وہ اور بھی شرمائی، شاید اپنی تعریف سن کر خوش ہوگئی، پھر وہ آہستہ سے کھڑی ہوگئی، اس نے ٹھلیا پانی سے نکال کر اپنے سر پر رکھ لی اور اپنے دونوں بازو اس کے نیچے باندھ لئے، میں نے آہستہ سے کہا۔کیا ہمیں رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ مل سکتی ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، میرا شوفر بھی میرے ساتھ ہی ہے۔

نیرا نے فوراً جواب دیا "کیوں نہیں، بے شک میرے بابا آپ کو ضرور جگہ دیں گے، آیئے۔ گو ہم بہت غریب لوگ ہیں، لیکن یہاں اور کوئی رہتا بھی نہیں، میرے ساتھ آیئے"

دو دن کے بعد سحر کے دھندلکے میں، اسی سڑک کے کنارے، میں اور نیرا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ڈرائیور نے آخرکار، کار کو درست کرلیا تھا اور اب ہم الوداع کہنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ میں نے نیرا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور نہایت حسرت

سے اسے الوداع کہی، نیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے، ہاں وہ آنسوؤں والی تھی، نیرا، دو دن ہم دونوں نے اکٹھے گزارے وہ ایک پاک صاف اور معصوم ہستی تھی، جیسے کہ صرف جنگل کے رہنے والے ہی ہو سکتے ہیں، دو دن، دو خوب صورت خوشیوں سے بھرے ہوئے دن! میں نے نیرا اور اس کے والد جنگل کے بوڑھے شکاری کی سادہ اور حسین زندگی سے بہت کچھ سیکھا، دو دن، جو مسرت افروز لمحوں کی طرح جلد ہی ختم ہو گئے ان دو دنوں میں نیرا نے مجھے اپنے چھوٹے سے باغیچے میں کھلے ہوئے پھول دکھائے، اپنی کیاریاں، گائیں اور دھان کے کھیت، اور میں نے؟ ——— میں نے اسے حسن و محبت کے افسانے سنائے اور سیاہ دلوں کی ابلہ فریبیاں بیان کیں میں نے اسے بہت سی باتوں کے متعلق خبردار کیا کیوں کہ وہ بہت ہی معصوم تھی، خطرناک حد تک معصوم سب سے بڑھ کر میں نے اسے اس چیز کے متعلق خبردار کیا جسے لوگ تہذیب کے مقدس نام سے پکارتے ہیں تہذیب! جو، اب جلد ہی اس سڑک کے ذریعے اس علاقے

میں پھیلنے والی تھی وہ نہایت خاموشی سے میری باتوں کو سنتی، ایک آہ بھر کر میرا شکریہ ادا کرتی اور پھر چُپ ہوجاتی اور اب ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے۔

میں نے چوتھی بار اس سے کہا، اچھا نیرا، الوداع۔

اُس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے کوٹ کو پکڑلیا، "مت جاؤ پردیسی کیا تم ضرور چلے جاؤ گے" سچ مچ اس غریب لڑکی کو مجھ سے اُنس سا ہوگیا تھا۔ میں نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ نرم لہجے میں کہا میں تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔ نیرا، ضرور، ہاں، اب مجھے اجازت دو۔ اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ مجھے الوداع کہو، نیرا"

نیرا اپنے آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ سحر کے اڑتے ہوئے دھندلکے میں میں نے دیکھا کہ نیرا کی پلکوں پر آنسو پھول کی پتیوں پر شبنم کے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں اس نے جلدی سے الوداع کہی اور پھر یک لخت منہ موڑ کر سامنے کی گھاٹی پر چڑھنے لگی اوپر، اور اوپر، وہ گھاٹی کے اوپر چڑھتی گئی اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑکر نہ دیکھا۔ گھاٹی کی چوٹی

پر سورج کی کرنوں نے اس کی پیشانی کو چوما اور اس کے گرد ایک حسین ہالہ بنا دیا، اب وہ گا رہی تھی ایک میٹھا پُرسوز پہاڑی گیت جس کے الفاظ میرے کانوں نے نہ سنے لیکن جس کا جان گداز نغمہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا میں اسے بیان نہیں کر سکتا، لیکن اس گیت کی وہ لے، وہ اس کا لازوال حُسن، تڑپ اور درد آج تک میرے کلیجے میں محفوظ ہے۔

انجنیئر چپ ہو گیا، کمرے میں کتنی دیر تک خاموشی طاری رہی، آگ مدھم ہو چکی تھی۔ اور دیواروں پر لمبے لمبے سائے ناچ رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد میں نے آرام کرسی سے سر اٹھایا اور انجنیئر کی طرف مڑ کر پوچھا، کیا تم پھر کبھی نیرا سے ملے؟

لیکن انجنیئر سو گیا تھا، اس کا سگار اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا اور غالیچے پر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔

بچپن

رفیع کو نیلا سے بہت محبت تھی، یوں تو رفیع کو ہر چیز سے محبت تھی۔ خوش نما رنگا رنگ تیتریوں کو باغ میں اڑتے دیکھ کر اس کا دل یکایک بے تاب ہوجاتا اور وہ اُن کے پیچھے خوشی کی وحشیانہ چیخیں مارتا ہوا پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگا بھاگا پھرتا اور جھٹ سے اپنے پھندنے والی ٹوپی سر سے اتار کر لاجوردی رنگوں والی ایک تیتری کو اس میں قید کرلیتا۔ پھر آہستہ سے حیرت اور پیار بھری نگاہوں سے تیتری کی طرف دیکھتا، اسے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک انگلیوں میں پکڑ کر اِدھر اُدھر گھومتا، تیتری کے پر پھڑپھڑاتے اور یکایک اس کا دل رحم کے جذبات سے اتنا بھر جاتا کہ اس کی آنکھوں میں

آنسو چمکنے لگتے اور وہ اسے یک لخت چھوڑ دیتا۔ تیتری اڑتی ہوئی دُور سونف کے پودوں سے پرے شفتالوؤں کے درختوں کی چوٹیوں سے گزر جاتی۔ رفیع حیرت بھری نگاہوں سے اُڑتی ہوئی خوب صورت تیتری کی طرف دیکھتا۔ کتنی اچھی تیتری تھی! محبّت اور افسوس، یکایک ایک۔ اور تیتری، سبز اور پیلے پیلے پروں والی پہلی تیتری سے بھی زیادہ حسین اور درخشاں سنگھدراج کے پھولوں کے اوپر اُڑتی ہوئی دکھائی دیتی اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا سنگھ راج کے تختوں کی طرف دوڑنے لگتا۔ اسے واقعی تیتریوں سے محبّت تھی۔

اسے آڑوؤں سے بھی محبّت تھی، اور سیبوں سے بھی، اور لال لال رنگ کے شربتی انگوروں سے بھی۔ جب درختوں پر سیب سونے کے گیندوں کی طرح چمکتے اور لمبی لمبی سبز بیلوں میں پہاڑی انگور یاقوت کی طرح دمکتے تو انھیں دیکھ کر رفیع کا دل کسی نامعلوم خوشی سے کانپنے لگتا۔ صرف دل ہی نہیں بلکہ ٹانگیں بھی، وہ چاہتا کہ وہ جلد جلد درخت کی اونچی شاخوں پر چڑھ جائے اور ہر ایک آڑو کو اپنے ننکر کی ننھی ننھی جیبوں

ں بھر لے۔ ہر سیب کو، انگوروں کے ہر خوشے کو اپنے گالوں
کے اندر یا شاید اپنے دل کے اندر چھپا لے وہ نہیں
چاہتا تھا۔ کہ دنیا کا کوئی اور فرد اُس کے سیبوں، آڑوؤں
انگوروں اور ناشپاتیوں کی طرف نگاہ بھی اٹھائے۔ اُسے یقیناً
ان سے محبّت تھی اور باغ کے مالی کو یہ اچھی طرح معلوم تھا۔
اور پھر اسے اپنی انّا سے محبت تھی۔ جب امّاں انا کو
بھی جھڑک دتیں، اور انّا اُداس سی صورت بنائے آنچل کے
ایک کونے سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جا
ور رفیع اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا، سہم سہم کر قدم اٹھاتا ہوا چپکے
سے انّا کے کمرے میں چلا جاتا، اور انا کے سیاہ لہنگے کا کونا پکڑ کر
کھڑا ہو جاتا۔ وہ اداس، معصوم اور پیار بھری نگاہوں سے
اپنی انا کی طرف دیکھتا — وہ انا کو چپ کرانا چاہتا وہ اسے
ڈھارس دینا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کیوں وہ کچھ نہ کرسکتا،
پھر یکایک اس کا گلا بھر آتا، اور انا کو روتے دیکھ کر وہ
بھی بے اختیار سسکیاں لینے لگتا پھر انّا اسے اپنی گود میں لے
لیتی۔ اسے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچ کر چھاتی سے لگا
لیتی۔ اپنے گیلے رخسار اُس کے نرم نرم گالوں سے لگا دیتی اُس کا

منہ اتنی بار چومتی کہ اس کا دم رُکنے لگتا ۔ پھر آہستہ آہستہ
کی سسکیاں بند ہوجاتیں ، اور اس کے آنسو خشک ہوجا
——— ہاں اسے اپنی آنا سے محبّت تھی ۔
لیکن آنا سے محبت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے ا
اچھی نہیں لگتی تھی ۔ امّی تو اس کی جان تھی ۔ لیکن وہ
کرے ۔ امّاں ہی اسے ہر وقت اپنے پاس نہ رہنے دیتی تھی
جاؤ ننھے باغ میں کھیلو ، جاؤ منے سکول جاؤ ۔ رفیع سیر کو جا
وہ جب دیکھتا ، امّی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتیں ، ا
کچن میں جائیں تو وہ پیچھے بھاگتا ۔ اور کروشیا یا سلائیاں
لے کر بیٹھتیں تو وہ صوفے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہوجاتا ۔ ا
امّی کے بالوں سے کھیلنے لگ جاتا ۔ امّاں جھڑک دیتیں " ت
تم نے سبق نہیں یاد کیا " اور وہ سہم جاتا ، " جاؤ کام
اور وہ دھیمے دھیمے قدموں سے واپس چلا جاتا ، اسے تو ا
سے محبّت تھی ، لیکن اماں ہی اسے ہر وقت پیار نہیں کرتی تھ
جب گھر میں مہمان عورتیں آتیں تو وہ مچل جاتا اور بار
اماں کے پاس جا کھڑا ہوتا ۔ لیکن اماں اسے یونہی چمکار
کہہ دتیں ، " رفیع بیٹا باہر کھیلو "

ہاں کبھی کبھی وہ اماں کی گھرکیوں کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ اماں طشتری اٹھائے ہوئے ابا کے لئے کھانے کے کمرے میں تراشے ہوئے پھل لے جارہی ہوتیں کہ وہ ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ شریر ننھے شریر رفیع کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ اردو کی تیسری کتاب اٹھائے ہوئے اماں کے ارد گرد شور مچاتا ہوا بھاگتا اور انھیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیتا۔ تھک کر اور ہار کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتیں، اماں کی میٹھی اور مہربان نگاہیں دیکھ کر وہ ان کی گردن سے لپٹ جاتا۔ "میری اچھی امی"

وہ ابا جی کو بھی بہت چاہتا تھا، اگرچہ اسے پتہ تھا کہ ابا بہت بڑے آدمی ہیں۔ اور نرم لہجے میں بہت کم بات کرتے ہیں، پھر بھی وہ انھیں بہت چاہتا تھا، اگر وہ دورے پر جاتے تو وہ ہمیشہ ضد کرتا "مجھے بھی ساتھ لے چلو ابا۔ لے چلو نا ابا، اچھے ابا جی، ابا جی" لیکن ان منتوں سماجتوں کا ابا جی پر ہمیشہ کم اثر ہوتا تھا، اور تو اور وہ شام کو سیر کرنے کے وقت بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ چلے جایا کرتے اور بیچارا رفیع چیختا ہی رہتا ابا دورے سے واپس آتے تو وہ کتنی دیر پہلے ہی ایک اونچے

ٹیلے پر چڑھ کر ابا کی راہ دیکھتا رہتا، اور جب ابا دور سے ہی گھوڑے پر سوار ندی کے قریب کی پگڈنڈی پر نظر آجاتے تو وہ فرطِ مسرت سے چلا اٹھتا، ابا جی آئے، وہ آئے۔ وہ آئے! ہاں وہ ابا جی کو بہت چاہتا تھا۔

لیکن محبت تو اسے نیلا سے ہی تھی، نیلا بیگم فتح دین چپراسی کی لڑکی تھی عمر میں شاید رفیع سے ایک برس بڑی ہی تھی، شاید اسی وجہ سے وہ بچارے رفیع کی پروا تک نہ کرتی تھی ممکن ہے کہ کوئی اور وجہ بھی ہو، لیکن اس کا رفیع کو پتہ نہ تھا۔ بہرحال رفیع کو جتنی نیلا سے محبت تھی، اتنی ہی نیلا اس سے بے گانہ تھی، اس نے تو آج تک کبھی رفیع سے بات بھی نہ کی تھی، بلکہ جب کبھی وہ رفیع کے پاس سے گزرتی (اور رفیع کو ایسے موقعے بہت کم ملے ہوں گے) تو سر اٹھا کر اپنے خوب صورت گھونگر والے بالوں کو چھٹکا کر اس کے پاس سے گزر جاتی غریب رفیع کو اس وقت بہت ہی ذہنی تکلیف ہوتی تھی وہ اس چھوٹے سے قصبہ کے ہر ننھے گڈریے سے ہنس ہنس کر بات کرتی تھی۔ مگر بچارے رفیع کو ہی یہ مسرت حاصل نہ ہوئی تھی۔

یوں تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی، رفیع کی معصوم زندگی میں چند ایک ہی ایسے تکلیف دہ لمحے آئے تھے، ورنہ دن بھر تو وہ نیلا کو کم وبیش یاد بھی نہ رکھتا تھا۔ سکول کی قید، ماسٹر کی گھرکیاں، حساب کے سوال جمع تفریق ضرب تقسیم، باغ میں اچھل کود، رات کو وہ جب تھک کر بستر پہ لیٹتا تو بس، پھر صبح امی ہی اسے مشکل سے جگاتی تھیں۔

لیکن جب نیلا سامنے آجاتی یا جب وہ باغ میں پھولوں سے اکیلا کھیلتا کھیلتا اکتا جاتا، تو نیلا کی حسین گڑیا جیسی صورت کا خیال کر کے وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ خود نیلا کو بلائے، بھلا وہ سے کیا کہے گی۔ اچھا تو، بھلا وہ اس سے ہی کیوں نہیں بولتی۔ یک دن جب وہ یوں ہی کھیلتا کھیلتا ندی کے کنارے چلا گیا تھا جہاں ندی پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ تبدیل کرتی ہوئی جنوب کی طرف مڑ جاتی تھی تو وہاں اس نے بلند تنگ کے بہت بڑے درخت کے نیچے بہت سے اپنے ہمجولی بیٹھے۔ کئی پتنگیں بڑھا رہے تھے کئی بانسریاں بجا رہے تھے ی بچھڑی ہوئی بھیڑ بکریوں کو آوازیں دے دے کر واپس

بلا رہے تھے ۔ دو تین ندی کے کنارے نہا رہے تھے ۔ اور ندی کے نیلے پانی میں تیرنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے ایک طرف منوہر صادق حسنی وزاں کیتھری اور بہت سے لڑکے لڑکیاں ریت کے ٹیلے کھود کھود کر عالی شان محل بنا رہے تھے، رفیع بھی ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگا ۔ ان میں نیلا بھی تھی ۔ وہ بہت دیر تک ان کے ساتھ کھیلتا رہا ۔ لیکن معلوم نہیں کیوں نہ اس نے نیلا سے بات کی، نہ نیلا نے اس سے ۔ کھیلتے کھیلتے نیلا اور کیتھری جھولے کے قریب چلی گئیں، اور پینگ بڑھانے لگیں ۔ رفیع حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا ۔ اس نے آج تک کبھی پینگ نہ بڑھائی تھی ۔ اتنی اونچی اسے تو جھولے پر بیٹھنے سے بھی ڈر لگتا تھا ۔

صادق بانسری بجا رہا تھا ۔ رک کر بولا "پینگ بڑھاؤ گے ؟"

رفیع انکار نہ کر سکا، خاص کر نیلا کے سامنے جو دوسرے جھولے سے اتر کر اب پاس کھڑی مسکرا رہی تھی ۔

رفیع ڈرتے ڈرتے جھولے پر چڑھا ۔ لیکن اب اسے پینگ بڑھانے کا ڈھب نہ آتا تھا ناچار کہنے لگا ۔ مجھے جھولا دو ۔

یہ سُن کر بہت لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے ۔ رفیع کو ایسا معلوم

ہوا کہ نیلا کی ہنسی ان سب میں سے بلند تھی، وہ شرمندہ سا ہو گیا اور جھولے سے اتر کر سیدھا گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ غمگین اور اداس جا رہا تھا، اسے کسی پر غصہ نہ تھا۔ صرف اسے بار بار نیلا پہ غصہ آ رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں۔ اور جب وہ بڑے پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" امّا نے پوچھا۔

"کیوں رو رہے ہو بیٹا؟"

"بیٹا رفیع کیا بات ہے"؟

"میرے رفیع کو کس نے مارا ہے"!

"ننھے تم اتنی دیر کہاں کھیلتے رہے۔ یہاں بچارا مالی ڈیڑھ دو گھنٹے سے تمھاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے، بولو رفیع ننھے"!

لیکن ننھا رفیع دیر تک روتا رہا۔ آخر جب وہ چپ ہوا۔ تو سسکیوں کے درمیان میں رک رک کر بولا:۔

"میں ..... میں ..... ایک جھولا ..... یک جھولا لگوا دو امی"

نیلا رفیع کے ہاں کئی بار آئی کبھی امی سے مٹھائی لینے کے لئے کبھی کوئی کپڑوں کا جوڑا لینے کے لئے۔ کبھی پکے ہوئے اخروٹ دینے کے لئے۔ جو اس کے گھر کے آنگن میں اگے ہوئے درخت پر لگتے تھے لیکن رفیع اسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی بار رات کو سوتے وقت جب امّاں اسے پریوں کی کہانیاں سناتی تو وہ سوچا کرتا کہ کیا پریاں نیلا کی طرح خوب صورت اور مغرور ہوا کرتی ہیں لیکن یہ بات امّاں سے پوچھنے کا اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ نیلا اسے ایک مورت کی طرح پیاری لگتی تھی، کبھی وہ سوچتا، اس کے گال کتنے لال لال ہیں اور اسکے ہونٹ، اس کے اپنے گالوں یا ہونٹوں کا رنگ تو اتنا صاف نہ تھا، اچھا تو اگر وہ بھی نیلا کی طرح خوبصورت بن جائے، تو کیا پھر بھی نیلا اس سے نہ بولے گی، یہ خیال اسے اس وقت آیا جب کہ وہ سنبلو کی ایک اونچی جھاڑی کے قریب کھڑا ہوا پکے ہوئے سرخ سرخ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ ان سنبلوؤں کا رنگ کتنا سرخ تھا۔ سنبلو کھاتے کھاتے اس نے چار پانچ سنبلو توڑ کر اپنے گالوں پر مل لئے اور اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو بالکل لال کر لیا۔ پھر یکایک اسے دوسری جھاڑی کے قریب ایک خوب صورت تتیری دکھائی دی اور وہ نیلا کے متعلق

سب کچھ بھول گیا۔ وہ کتنی دیر تک تتلیاں پکڑنے میں مصروف رہا۔ آج اس نے سات خوب صورت تتلیاں پکڑیں اور انھیں پھر اس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں جمع کر لیا، اور انھیں گھر لے گیا۔

اماں نے پوچھا۔ "یہ منہ کیوں لال کر رکھا ہے۔ شاید آج پھر سنبلو کھاتے رہے ہو۔ میں نے تمھیں کئی بار سمجھایا ہے کہ سنبلو نہ کھایا کرو۔ لیکن تم مانتے ہی نہیں، کیوں؟ ان بچاری تتلیوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟"

جب رفیع کے ایک دو طمانچے لگے تو وہ زور زور سے رونے لگا۔

عید کے دن فتح دین کی لڑکی حسب معمول ایک رومال میں خوبانیاں باندھ کر رفیع کے گھر دینے آئی۔ رفیع گھر پر موجود نہ تھا وہ باغ میں باڑ کے قریب چنبیلی کے پھولوں کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا، اور ہار بنانے کی کوشش کر رہا تھا، نیلا نے خوبانیاں دے کر باغ کے قریب سے گزری تو رفیع کو باڑ کے قریب بیٹھے دیکھ کر رک گئی، وہ مزے سے ہار بنانے میں

مشغول تھا۔

رفیع بچارے کو پتہ ہی نہ تھا کہ نیلا پاس ہی کھڑی ہے یکایک نیلا نے باڑ سے ایک ٹہنی توڑی۔ رفیع نے سر اٹھا کر دیکھا، نیلا تھی، اس کا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔ اس نے ہار بنانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر باڑ کے قریب کھڑا ہوگیا۔

نیلا بولی "تمھارا نام رفیع ہے؟"

"ہاں، رفیع!"

"رفیع!"

"رفیع کیا نام ہے؟" نیلا نے اپنی چھوٹی سی ناک کو اوپر کر کے کہا۔

"رفیع نہیں، رفیع!"

نیلا بولی "میرا نام نیلا ہے۔ ہم وہاں رہتے ہیں (انگلی سے اشارہ کر کے) وہ اُن اخروٹ کے درختوں کے پیچھے۔"

رفیع کہنے لگا "ہمارے ہاں چنبیلی کے پھول بہت اچھے ہیں"

نیلا بولی "ہمارے ہاں خوبانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں"

رفیع کہنے لگا "ہمارے باغ میں بھی بہت اچھی خوبانیاں ہیں"

نیلا نے سر ہلا کر کہا "جھوٹ۔ ہماری خوبانیاں سب سے

سیٹھی ہوتی ہیں۔"

رفیع کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا "میں پینگ بڑھا سکتا ہوں۔ بہت اونچی لے جا سکتا ہوں۔"

"اچھا؟" نیلا نے ایسے کہا جیسے اس کی بات پر یقین نہ آرہا ہو۔

"میں اپنے باغ کے ہر درخت پر چڑھ سکتا ہوں۔"

"ہوں؟"

میں ——— میں چنبیلی کے ہار بنا رہا ہوں۔ یہ دیکھو!"

نیلا بولی "ہم تم سے اچھے ہار بنا سکتے ہیں۔ ادھر دکھاؤ پھول!"

رفیع نے نیلا کا ہاتھ پکڑا اور اسے باڑ کے اس طرف لے آیا۔ پھر دونوں بیٹھ کر ہار بنانے لگے، ہار بناتے بناتے نیلا ہنسنے لگی۔

رفیع نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں ہنستی ہو؟ کیا بات ہے؟"

نیلا ہنستے ہوئے کہنے لگی ..... میں کہتی ہوں تم ہار نہیں بنا سکتے۔ اور کیا؟"

رفیع کو جو غصہ آیا تو اس نے نیلا کے ایک طمانچہ لگا دیا۔ نیلا کہاں ہنس رہی تھی، کہاں اب زور زور سے رونے لگی۔ نیلا کو روتے دیکھ کر رفیع بہت پریشان ہوا۔ کیا کرے۔ کیا نہ کرے، اگر امّی کو پتہ لگ گیا کہ اس نے نیلا کے طمانچہ لگایا ہے تو پٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ نیلا کی منتیں کرنے لگا،

اچھا نیلا جانے دو مت روؤ۔ میں کہتا ہوں، مت روؤ، دیکھو میرے پاس تیتریوں کے تین سو پر ہیں، وہ اندر ڈبے میں بند رکھے ہیں، میں وہ سب تمھیں دے دوں گا، لو اب تم نہ روؤ۔ میں تمھیں ابھی لا کر دیتا ہوں۔

رفیع دوڑتا دوڑتا گھر گیا اور تیتری کے پروں والا ڈبہ لے آیا، اور ڈبہ کھول کر نیلا کے سامنے رکھ دیا۔ کتنے اچھے پر ہیں۔ یہ دیکھو، دیکھو نا۔ نیلا، مت روؤ، اور یہ سب پھول اور ہار بھی تمھارے ہوئے۔ رفیع نے ایک دو ہار اٹھا کر نیلا کے گلے میں پہنا دیئے۔

نیلا روتے روتے ہنسنے لگی۔

اس دن سے نیلا اور رفیع اکٹھے کھیلتے رہے۔ انھوں نے جھاڑیوں سے سنبلو چن چن کر کھائے۔ انگور کی بیلوں پر چڑھ کر

سونے کی طرح چمکنے والے انگوروں کے خوشے توڑے۔ نیلا کے گھر میں اخروٹ کے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر "قاضی کو لڑا" اور بچپن کے دوسرے محبوب و مرغوب کھیل کھیلے وہ ندی کے کنارے جا کر گڈریوں کے ساتھ ناچے ..... پینگیں بڑھائیں، بانسریوں کے گیت سنے، کبھی کبھی رفیع دودھا بنتا تھا اور نیلا دلھن، اور گھاٹی کے دامن میں ننھے ننھے گڈریئے براتی بنے ہوئے، شور مچاتے ہوئے کاغذ کی ڈفلیاں بجاتے ہوئے بھاگتے پھرتے تھے، ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا اور جب کبھی نیلا کھیل ہی کھیل میں شوخی یا شرارت سے کسی دوسرے گڈریئے کی دلھن بن جانے پر آمادگی ظاہر کرتی تو رفیع بگڑ کھڑا ہوتا۔ اور کھیل میں حصہ لینے سے انکار کر دیتا اور لڑائی پر تل جاتا یا نیلا سے روٹھ جاتا۔ روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے نیلا کو کیسی کیسی منتیں کرنی پڑتی تھیں اور بہت سخت سخت قسمیں کھانی پڑتی تھیں۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اس خوبصورت وادی میں دو ننھے دلوں نے پاک اور معصوم محبت کا ایک میٹھا، سہانا اور پیارا سپنا دیکھا۔ وہ سپنا جو پہاڑی جھرنوں کے گیتوں کی طرح دلفریب تھا۔ وہ محبت جو ستاروں کی طرح روشن اور بلند

تھی، پھر یکایک رفیع کے والد کی تبدیلی کسی اور جگہ ہو گئی اور رفیع اور نیلا نے دھڑکتے ہوئے دلوں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ رفیع نے جاتے وقت وہ چیز بھی نیلا کو دے دی جسے وہ اپنی جان سے بھی عزیز رکھتا تھا۔ یہ ایک چاقو تھا۔ جس کا پھل بہت تیز اور چمکدار تھا اور دستے پر رنگ برنگ کے سیپ لگے ہوئے تھے۔ اور نیلا؟ ..... نیلا نے بھی اپنی سبز منکوں کی مالا جسے وہ ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رکھتی تھی اتار کر رفیع کو دے دی اور یہ سب کچھ چھپ چھپ کر ہوا۔ لیکن ٹھیک اس وقت کہ جب رفیع کے گھر کے لوگ روانہ ہونے کو تھے اور رفیع کو ایک گھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا۔ نیلا سسکیاں لیتی ہوئی رو پڑی رفیع کا دل بے تاب ہو گیا۔ لیکن اس وقت اس نے نہایت ہمت سے کام لیا۔ اس نے اپنے آنسو روک لئے۔ اور منہ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

تیرہ سال اور گزر گئے اور پھر ایک بار رفیع کے وال

کی تبدیلی اسی حسین وادی میں ہوئی جہاں نیلا رہتی تھی، رفیع کے دل میں بچپن کے خواب جاگ اٹھے اور اس عہد کی معصوم خوشیاں اور اس زرّیں زمانے کی تمنّائیں دل میں کروٹیں لینے لگیں۔ کیا وہ نیلا کو بھول گیا تھا؟ کیا کالج کی ہنگامی زندگی نے اس کے دل پر بچپن کا کوئی بھی نقش باقی نہ رہنے دیا تھا؟ کیا اب بھی وہ نیلا کو اسی طرح چاہتا تھا؟ ان سب باتوں کا جواب شاید رفیع بھی اچھی طرح سے نہ دے سکتا تھا۔ ہاں شاید وہ نیلا کو قریبًا بھول ہی گیا تھا۔ لیکن بالکل نہیں، وہ سبز منکوں کی مالا ابھی تک اس کے پاس تھی اور کسی قیمت پر بھی وہ اسے اپنے آپ سے جدا نہ کر سکتا تھا۔

کالج کے پُر مسرّت لمحوں میں بھی اس نے اکثر نیلا کو یاد کیا لیکن یوں ہی کبھی وہ اپنے بچپن کے دلکش کھیلوں کو یاد کر کے سکرا دیتا۔ عجیب زمانہ تھا۔ نہ ہاکی نہ فٹ بال نہ ٹینس، پھر بھی کتنی مسرّت تھی ان کھیلوں میں اور نیلا، وہ ننھی سی شوخ گڑیا تلا کر باتیں کرتی ہوئی، ایک عجیب دلکش ادا سے ہنستی ہوئی۔

لیکن اب جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے گھر آ کر نیلا کو پایا تو حیران رہ گیا، آخری بار جب اس نے نیلا کو دیکھا تھا۔

تو وہ ایک ننھی سی پری تھی۔ جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر روتی جاتی تھی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی پھر تیرہ سال تک اس کے تخیّل میں نیلا کی یہی تصویر رہی وہ خود لڑکپن سے شباب میں آ گیا۔ اس کے والد کے سر کے بال سفید ہو گئے۔ باغ میں ناشپاتیوں کے وہ درخت جو آج سے تیرہ سال پہلے نہایت پتلے اور چھوٹے تنوں کے پودے تھے۔ آج اپنی شاخیں آسمان کی طرف بلند کئے کھڑے تھے، اور نیلا ——— وہ ننھی سی گڑیا؟

لیکن جلد ہی وہ نیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا تھا، کہ کوئی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں یہ نیلا ہی تھی، سرو کی طرح بلند قامت، شباب کی رعنائیوں کا مرقع جمیل، اس کے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی، جو شاید سورج کی کرنوں سے مل کر بنی تھی۔ اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا بچہ تھا۔

رفیع اٹھ کھڑا ہوا،

نیلا بولی "تم نے مجھے پہچانا بھیّا؟"

رفیع کے منہ سے نکلا۔نیلا ؟

نیلا ہنسنے لگی ، وہی دلکش ہنسی ، بچہ رفیع کو دیکھ کر کلکاریاں مارنے اور زور زور سے بازو ہلانے لگا۔

رفیع نے آگے بڑھ کر اور بچے کے شانوں کو چھو کر کہا۔"یہ تمھارا لڑکا ہے نا ، کتنا خوب صورت ہے۔ اس کا کیا نام ہے ؟

نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ ہاں، اس کا نام ہے رفیع ، محمد رفیع ،

کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا۔ نہ اس کے پاؤں تلے زمین تھی اور نہ سر پہ آسمان ، وہ خلا میں گھوم رہا تھا، نہایت نرمی سے گھوم رہا تھا، پھر یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا وہ چھوٹا سا تھا، ننھا رفیع ، اور نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تتیریاں پکڑ رہا تھا۔نیلا اور وہ سنبلو کی شاخوں پر جھکے سنبلو کھا رہے تھے۔ ندی کے کنارے بچے تنگ پر جھولا جھول رہے تھے۔ گڈریئے بانسریاں بجا رہے تھے۔گڈریئے برائی بنے ہوئے تھے اور نیلا اس کی دلھن، بچے نے رفیع کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

با . . . . با . . با ، با . . . . . .

رفیع بچے کی طرف جھکا پھر اس نے آہستہ سے اپنی جیب کے اندر سے کوئی چیز نکالی ، یہ سبز موتیوں کی ایک مالا تھی آہستہ سے اس نے یہ مالا بچے کے گلے میں ڈال دی ۔

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے ، لیکن رفیع نے نہایت ہمت سے کام لے کر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا اور نگاہیں اٹھا کر گھاٹی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا ۔ جہاں سفید سفید چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے ۔

گل فروش

جب گل فروش کا بیٹا "میٹرک" پاس کر چکا تو بوڑھے باپ نے بیٹے کے ہاتھ میں ایک سائیکل دے کر یوں کہا "جا بیٹا نوکری تلاش کر!" بالکل اسی طرح جیسے قرون وسطیٰ کا ناول نویس اپنے قصے کے ہیرو کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں کسی بے آب و گیاہ خطۂ صحرائی میں چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی، بے چارے لڑکے کے سائیکل چلاتے چلاتے تخنے زخمی ہو گئے، ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ وہ معصوم پھول سا چہرہ کملا گیا۔ مگر نوکری کہیں نہ ملی، گوہر مقصود نہ ہاتھ آیا پر نہ آیا۔

آخر ہار مان کر اور سائیکل کا ہنڈل توڑ کر گل فروش کے بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ سے کہا۔ "ابا نوکری ملنا کچھ آسان نہیں۔

یہاں تو اس کے لئے بڑے بڑے مارے مارے پھرتے ہیں۔ مَیں غریب کیا کروں ؟"

بوڑھے باپ نے چلم پر سے راکھ جھاڑی اور رک رک کر بولا۔" کرنا ۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔ ہے ؟ دکان پر بیٹھ جا ۔۔۔۔ گل فروش کا بیٹا بھی گل فروش ہے ۔۔۔۔ پھول بیچ اور گزارہ کر ۔۔۔۔ مولوی ٹھیک کہتا تھا، اس لونڈے کو انگریزی کیوں پڑھاتے ہو۔ لمبے بال رکھے گا اور عورتوں کی طرح مانگ نکالے گا، کل سے یہ زلفیں کٹا دے اور ہار بنا! ۔۔۔۔۔۔ سنا تو نے ؟"

اتنا کہنے کے پانچ سال بعد۔ بوڑھا گل فروش راہئ عدم ہوا

بوڑھے باپ کے مرنے پر گل فروش نے اپنی دکان انارکلی کے سرے پر کرلی۔ انگریزی تعلیم نے اسے جدّت پسند بنا دیا تھا۔ اس نے ہار اور گجروں کے نئے نئے نمونے ایجاد کئے۔ اور مشہور و معروف فلم ایکٹرسوں پر اُن کے نام رکھے، گو ہر آ بہ گنجن ادا۔ گلِ گاربو۔ سلوچنا ہار وغیرہ، اور بھی کتنے ہی دل رُبا دل کش نمونے تھے جو تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوئے۔ اُن

دُکان بہت چمک اٹھی۔ اب اس نے ہاتھ بٹانے کے لئے دو تین ملازم بھی رکھ لئے۔ ریڈیو بھی لگا دیا۔ اخباروں میں اشتہار بھی دینے لگا، چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

نرگس کا سیزن آ گیا ہے۔

ہماری دکان پر تشریف لاکر نرگسی ہاروں کے "اپ ٹو ڈیٹ" ڈیزائن ملاحظہ فرمائیے۔

گریٹا گاربو کی نئی پکچر کی تقریب پر گل گاربو کے گجرے پہنئے اور پہنائیے!

پھولوں کے خوش نما آویزے آپ کے حسن کے بہترین محافظ ہیں!

پردے کا خاص انتظام ہے!

گل فروش کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ نہایت خوش گوار نکلا، ہار، گجرے وغیرہ پہننے کا پرانا دستور ہندوستانی سوسائٹی میں ازسرِنو

ختم ہو گیا۔ پہلے تو تہواروں پر بھی لوگ ہار کم پہنتے تھے۔ مگر اب کلرک، بابو، منشی لوگ، دفتر بھی پھول لے لے کر جانے لگے۔ چنانچہ سیاہی سے گندی میزیں اور قلم، ان پھولوں سے سج گئے، دفتر گلستان بن گئے۔ ہر طرف اک مہک سی اُڑی پھرتی تھی، کالج کے طلبہ تو ہاروں کے اس قدر شیدائی ہوئے کہ پھولوں کے ہار بھی اپنی ٹائی یا سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے چننے لگے، عورتوں اور پھولوں کا میل تو یوں بھی آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے، مگر اب تو انتہا ہی ہو گئی، اگر ایک خاتون سراپا "نرگس" بنی ہوئی جا رہی ہے تو دوسری "موتیا کی ڈالی" ایک زعفران زار تھی تو دوسری دھان کا کھیت جس کی بھینی بھینی خوشبو اور خوش نما ہریاول آنکھوں کو طراوت بخشتی تھی ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن ہندوستان کی ان قدیم روایات کو تازہ کرنے والے کا دل ہمیشہ غمگین و محزون ہی رہا نوجوان گل فروش ہمیشہ یہی سوچا کرتا، کہ اگر وہ پھول نہ بیچتا تو اس وقت تک کم از کم بی۔ اے پاس کر لیتا، اور پھر اسے "نوکری" کہیں مل ہی جاتی ——— اور پھر اس کی شادی بھی کسی تعلیم یافتہ حسین لڑکی سے ہو جاتی، اور یہ بالکل اغلب

لیکن .... اب ...... اب، وہ لمبے سانس بھرتے
ئے سوچتا۔ اب اس کی زندگی اس پھولوں کی دکان پر ریڈیو
ن کر اور گجرے بیچ کر برباد ہو گئی تھی، اب وہ محض ایک
ران، شکستہ، کھنڈر رائی زندگی کا مالک رہ گیا تھا، آثار
یمہ کے محکمہ کی طرح، تعلیم یافتہ لڑکی تو اس کے طبقے میں
ہزار بتیوں والا بجلی کا قمقمہ لے کر ڈھونڈنے پر بھی دستیاب
ہو سکتی تھی اور جو لوگ اپنی لڑکیاں سکولوں اور کالجوں میں
ماتے تھے غالباً ان کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ ان کی لڑکی کسی
ل بیچنے والے کے پلّے باندھ دی جائے، وہ سماج کا اچھوت
، ہری جن ..... ہری جن ..... اب ان اونچے طبقے والے
ں نے ایک نیا لفظ اسی پرانے خیال کو ادا کرنے کے لئے
اع کیا ہے، کچھ بھی ہو وہ اپنی زندگی ایک اجڈ اور پھوہڑ
ی کے ساتھ نہیں بسر کر سکتا تھا۔ جسے نہ تو باڈیس پہننے کا
یقہ ہے نہ ساڑھی لگانے کا قرینہ اور نہ ہی اخبار پڑھنے
عادت جو تمام دن اپنا سر جھٹے میں دیئے رکھتی ہو۔ اونہہ
...... وہ کسی عورت سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا
، باورچن سے نہیں! لیکن اس کے باوجود وہ دیکھ اور میں

ایک سادہ مزاج جوان سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً وہ اپنی بوڑھی ماں کی بہت عزت کیا کرتا تھا اور گو یہ بہت حیرت کی بات ہے۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اسے اپنے ننھے بھائی سے بہت محبت تھی اور گو وہ ریشم کی خوب صورت قمیصیں پہنتا تھا جن پر لمبی لمبی خوش رنگ دھاریاں ہوتیں۔ اور ع... چھیل لگاتا تھا، پھر بھی اسے شراب سگرٹ اور رنڈیو... سے بہت نفرت تھی، سنیما، تھیئٹر دیکھنے پر بھی اس کے چا... چلن میں کچھ فرق نہ آیا تھا۔ اس کے دوست اکثر اس پر تعج... کا اظہار کیا کرتے۔ آخر ایک پھول بیچنے والا کیونکر شر... رہ سکتا ہے؟

اس کی بوڑھی ماں کو بھی یہی شک تھا، یوں تو وہ اس... جان چھڑکتی تھی۔ مگر ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا "انٹرنس پا... بیٹا" آوارہ نہ ہو جائے، جو نوجوان پھول بیچتا ہو اور ... دیکھتا ہو اس کے لئے شریف رہنا بہت مشکل ہے، آخر کب... اسی لئے بوڑھی ماں اس کی شادی پر مصر تھی، مگر نو... گل فروش نہیں مانتا تھا، اس کے ناتجربہ کار، شاعرانہ... نے پڑھی لکھی لڑکی کی ایک خیالی حسین مورت بنا رکھی

وہ اسی کو پوجتا تھا اور اسی سے شادی کا خواہاں تھا۔
بس یہی جھگڑا تھا، ماں ایک میٹھی نرم مزاج، دیہاتی بہو کے حق میں تھیں اور ان کی نگاہ اپنے ہی قبیلے میں ایک قبول صورت، غریب طبیعت لڑکی پر تھی۔ گلفروش اس کے برعکس ایک ساڑھی نواز سینما پسند، تیتری کی تلاش میں تھا........ مگر آہ، یہ وہ تیتریاں تھیں جو اس کے گلدانوں پر کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتیں، کیا وہ سوسائٹی کا اچھوت نہ تھا...... محض ایک گلفروش!

ایک سنیچروار کی دل کش شام کا ذکر ہے، اس دن نشاط تھیئٹر ہے میں وکٹر ہیوگو کا لافانی شاہکار "لے مسزرابلز" دکھایا جانا تھا اور گلفروش دکان کو جلد بند کرنے اور وہاں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک چھوٹی سی "مارس" گل فروش کی دکان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس میں ایک جوان لڑکی اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھیں، گلفروش دکان کی سیڑھیاں اتر کر موٹر کے قریب گیا اور بوڑھی عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگا، "میم صاحبہ کیا حکم ہے؟" اس پر جوان

لڑکی نے موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "ہمیں کچھ ہار اور گجرے چاہئیں"

آیئے، دکان کے اندر تشریف لایئے"

لڑکی نے بہت سے ہار خریدے، بہت سے گجرے، چند ایک گلدستے، چلتے وقت کہنے لگی، "کل ہمارے ہاں ایک ڈانس ہے۔ بال روم کو سجانا ہوگا، کل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے آؤ، کوئی چار بجے شام کو اور دو گھنٹوں میں کام ختم کر دو، ٹھیک ہے؟"

گل فروش نے جواب میں سر جھکا دیا۔

جب وہ موٹر میں بیٹھ چکی تو نوجوان گل فروش نے پھر جھک کر سلام کیا اور انگریزی میں نوجوان لڑکی سے پوچھا "سرکار آپ کا پتہ؟"

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک خفیف سی جھلک، اس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے گردن کو ایک طرف جھٹکا کر کہا "۱۰، فلیش روڈ، پلیز!

نوجوان گلفروش نے چلتی ہوئی موٹر کو جھک کر ایک فرشی سلام کیا، اور آہستہ سے کہا "۱۰ فلیش روڈ پلیز!"

اس واقعے کے تین چار روز بعد گل فروش کی بوڑھی ماں کو محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی طور پر اداس ہے۔ وہ نہ صرف کھانا کم کھانے لگا تھا بلکہ اب وہ اکثر کھانا کھاتے ہوئے منٹوں ایک طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا تھا، ایک نوالہ منہ میں دوسرا ہاتھ میں لئے وہ کچھ سوچنے لگتا۔ پھر کچھ یاد آجانے پر ایک آہِ سرد بھر کر جلد جلد نوالے اٹھانے شروع کر دیتا کبھی وہ چمپا کی چاندنی جیسی حسین اور نازک کلیوں کو زرّیں تاروں میں پروتے ہوئے یکایک رک جاتا، مسکراتا، پھر فوراً غمگین ہو جاتا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے اور جب اس کی ماں اس سے دریافت کرتی، کیا بات ہے بیٹا؟ تو وہ اس درد بھرے سوال کے جواب میں ایک کھسیانی ہنسی ہنس دیتا اور کہتا "کچھ بھی نہیں اماں!"

اور اماں دل میں سوچتیں، ضرور کسی لڑکی نے اس کے دل کو موہ لیا ہے، یا اللہ وہ کون ہوگی؟ ——— میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟

خود بے چارے گلفروش کو بھی ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ

اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے ۔ وہ ہر روز حسین عورتیں دیکھتا تھا، اس نے تو سیکڑوں کے ہاتھوں میں گجرے پہنائے تھے نازک اندام کلائیوں میں گجرے پہننے کے نئے نئے انداز سکھائے تھے ۔ کتنی شوخ نگاہوں کے وار سہے تھے ! ہزاروں متبسّم لبوں سے شہد کی طرح میٹھی بولیاں سُنی تھیں، کسی کے گداز بازوؤں کے سڈول پن نے اسے اتنا متأثر نہ کیا تھا، اور توس قزحی ساڑھیوں کے خوش نما رنگ اس کے معصوم دل پر ہمیشہ سائے کی طرح گزر جاتے تھے ۔ لیکن اب یک لخت یہ کیا ہو گیا تھا ..... جب بال روم کو سجاتے وقت وہ بھی اس کے پاس آ کر ایک دم کے لئے کھڑی ہو گئی تھی تو اس کی آنکھیں کیوں جھپک گئی تھیں، سانس کیوں ایک لمحے کے لئے رک گئی تھی ۔ اور جب وسطی فانوس کو لمبے لمبے ہاروں سے مزین کرتے وقت اُس کی انگلیاں اُس کے ہاتھوں سے چھو گئی تھیں، تو اس کی رگوں کا خون کیوں ایک آتشِ سیال بن گیا تھا، اور پھر ..... جب ...... اسے بال روم سجاتے دیکھ کر وہ ایک دم پیانو کی طرف چلی گئی تھی تو وہ کیوں بے تاب ہو گیا تھا ۔ اور یہ کس قدر عجیب احساس تھا کہ اسے پیانو بجاتے سُن کر اسے

معلوم ہوا کہ کسی نے گویا اس کے دل کی تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں اور ان میں سے ایک رنگین و حزیں نغمہ پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہی احساسِ محبت تھا، وہ احساس جو عمر میں صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے گل فروش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، اور اس نے جلدی سے ایک کونے میں جا کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے،

اس امر کا صحیح اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے کہ لڑکی کے دل پر گل فروش کے جذبات نے غیر شعوری طور پر کیا اثرات پیدا کئے مگر یہ کہنے میں تو ذرا تامل نہیں کہ اب وہ اکثر اس کی دکان پر آیا کرتی تھی، یہی، پھولوں کے آویزے خریدنے کے لئے، گلدستے گجرے پسند کرنے کے لئے، لیکن یہ تو ایک اتنی معمولی سی بات تھی جسے کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی تھی۔ کالجوں کی کتنی ہی لڑکیاں روزانہ گلفروش کی دکان پر آیا کرتی تھیں، لیکن اس کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ وہ سب گل فروش سے محبت کرتی تھیں، پھولوں سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ باغ کے اُجڈ

Abdu Abdul Rauf

مالی سے محبت کی پینگیں بڑھائی جائیں - ایسی حماقت کون کریگا؟
اور صنفِ نازک تو ایسے معاملوں میں ہمیشہ مردوں کے مقابلے
میں زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیتی ہے، کون کہتا ہے کہ گلفروش
کبھی عقلمند نہ تھا - مگر اب تو نہ جانے اس کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا
تھا کہ جب وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے دکان میں داخل ہوتی
اس کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگتا، وہ
سمجھتا کہ وہ خفیف سی مسکراہٹ جو اس کے رنگیں لبوں پر کبھی کبھی
آجاتی تھی صرف اسی کے لیے تھی - اس کی صندلی کلائیوں میں
پڑی ہوئی نقرئی چوڑیوں کی میٹھی جھنجھناہٹ اسی کے کانوں کے
لیے پیدا ہوئی تھی اور سفید ساڑی میں چھپے ہوئے کانوں میں
گلاب کے پھولوں کے جھلملاتے ہوئے سرخ سرخ آویزے تھے:
اسی کی حریص نگاہوں کے لیے پہنے جاتے تھے - شاید؟ ....
وہ کبھی کبھی خیال کرلیتا کہ وہ یقیناً اس سے محبت کرتی ہے - کبھی
کسی اندھیری رات میں جب کوئی اسے دیکھ نہ سکے، اس کی کوٹھی
کے گرد چکر لگاتا اور مغربی سمت کے ایک کمرے میں روشنی دیکھ
کر خوش ہوتا اور پھر جب کبھی ایک چھریرا سا سایہ اس روشنی
کے ایک طرف سے ہو کر دوسری طرف کو گزر جاتا تو اس کے

دل کی حرکت یک بارگی تیز ہو جاتی اور یکایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کرتا، پھر وہ دیر تک کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا، حتیٰ کہ روشنی بجھ جاتی اور اس کے دل میں ایک اندھیرا سا چھا جاتا اور وہ اس گھبرائے ہوئے مسافر کی طرح جو اپنا راستہ بھول گیا ہو گھر کی راہ لیتا۔

اور اماں بے چاری دل میں روز کڑھتیں، ہائے اللہ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ رات دن کس فکر میں غلطاں رہتا ہے، کہیں کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی۔ کوئی آسیب؟ ..... پھر یکایک اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیتی اور سر جھکا کر چادر کاڑھنے لگتی۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔

ایک ابر آلود شام کو وہی موٹر جو آئی تو گل فروش نے دیکھا کہ بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی تھی، گل فروش کے جھک کر سلام کرنے پہ بوڑھی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا "گل دن کو بہت سے پھول اور ہار وغیرہ درکار ہوں گے اور رات کو بھی کوٹھی سج جا....."

بہت اچھا سرکار، گل فروش نے یہ کہہ کر ایک تیز نگاہ موٹر کی خالی سیٹ پر ڈالی،

بوڑھی عورت نے پھر مسکرا کر کہا۔"کل مس ہرمز جی کی شادی ہے نا، بہت سے پھول چاہئیں"

موٹر چل دی، غریب گل فروش سر جھکائے رہ گیا۔

دوسرے دن گل فروش کو ایسا معلوم ہوا کہ اسے ہلکا سا بخار ہے۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ مگر اسے آج تو بہت کام کرنا تھا، وہ بہت سویرے اٹھا اور دکان پر کام کرنے چلا گیا۔ آج وہ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا اس کی محبوبہ کی شادی تھی! آج اس نے وہ وہ خوبصورت ہار اور گجرے تیار کئے جو اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے۔ آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی!! اس نے پھولوں کو زریں تاروں میں الجھا کر نازک چادریں بنائیں۔ حسین گلدستے کلیوں کے چندن ہار تیار کئے اور موتیا کے نیم وا پھولوں سے ایک خوب صورت ٹکٹ تیار کیا۔ آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی!!

گل فروش نے کوٹھی کا کونہ کونہ پھولوں سے سجا دیا،

وہ آج نہایت انہماک سے کام کر رہا تھا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر بھاگا پھر رہا تھا، اپنے ملازموں کو ہدایات دیتا جاتا تھا، کتنی ہماہمی، کتنی رونق تھی!

بوڑھی عورت مسکراتی ہوئی اِدھر سے اُدھر نکل جاتی اور ایک سفید داڑھی والا گوری رنگت کا آدمی پہیوں والی آرام کرسی میں بیٹھا ہوا کرسی کو ہنڈل گھما کر اِدھر اُدھر دھکیلتا ہوا لے جا رہا تھا، ایک کمرے میں اس نے اپنی محبوبہ کو بھی دیکھا تھا، وہ اپنے قبول صورت بھائی کے پاس بیٹھی ——جھکی ہوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی اور پھر وہ دونوں آہستہ سے ہنس پڑے تھے، بھلا اسے دیکھ کر وہ گھبرا کر کیوں کھڑی ہو گئی تھی! ایک لمحہ ——— صرف ایک لمحہ کے لئے گل فروش نے اسے ملامت بار نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، کیا لڑکی کے نازک رنگین لب نرگس کی طرح زرد نہیں ہو گئے تھے اور کیا گل فروش نے قتی اس کی نگاہ کی خطا وارباں دیکھ لی تھیں؟ شاید یہ اس کا وہم ہی تھا، کیونکہ دوسرے لمحہ ہی میں وہ اپنے بھائی سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

کام کرتے کرتے شام ہوگئی، آسمان پر تارے نکل آئے، کوٹھی میں برقی قمقمے روشن ہو گئے، آج دن بھر سے گل فروش بھوکا تھا، بھوکا؟ نہیں۔ اسے بھوک لگی ہی نہ تھی اب اس کا کام ختم ہوگیا تھا۔ کوٹھی سج چکی تھی، بینڈ بج رہا تھا، گل فروش باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ کدھر جائے؟ اسے چاروں طرف اندھیرا نظر آرہا تھا اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، ..... وہ جانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھ لینا چاہتا تھا، اس نے ایک نیلے سے رومال میں موتیا کے پھولوں کا بنا ہوا مکٹ لپیٹ رکھا تھا، کاش وہ اپنے ہاتھوں سے یہ مکٹ اسے پہنا سکتا اور پھر اس کے قدموں میں گر جاتا ہے ——— بے وقوف گل فروش!

رات کے نو بجے فلیش روڈ سے موٹریں چلنا شروع ہوئیں آگے آگے نوشہ کی کار تھی پھولوں سے سجی ہوئی، اس میں دولھا اور دلھن بیٹھے تھے، اس کے پیچھے پیچھے بیس تیس موٹریں ہارن بجاتی ہوئی آرہی تھیں، فلیش روڈ سے ٹرنگلٹن روڈ تک

تو لوگوں کا بہت ہجوم تھا بلند قہقہے اور ہارنوں کی دلخراش آوازیں ۔ موٹروں کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ اور کسی آوارہ کتے کا بھونکنا ..... خدا خدا کرکے جب ٹرنگٹن روڈ گزر گئی تو موٹروں نے تیز ہونا شروع کیا ۔ اور جب ناپ روڈ آ گئی تو نوشاہ کی کار خوشی سے اڑی جارہی تھی یہاں ایک خوش گوار سا اندھیرا تھا ۔ بجلی کے کھمبے بھی دور دور تھے اور دو رویہ گھن دار درخت کھڑے تھے ۔

یکایک نوشاہ کو سامنے سے ایک شخص بھاگتا ہوا آیا ، اس کے بازو کھلے تھے اور وہ عین موٹر کی سمت بڑھتا ہوا آ رہا تھا نوشاہ نے زور سے ہارن بجایا ۔ اور موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا ، اس نے بریک بھی دبائی ، مگر وہ یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا ، وہ پاگل شخص موٹر کے نیچے آ چکا تھا ، اس کی چھاتی اور بائیں بازو سے خون بہ رہا تھا !

دلھن ایک دل خراش چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی

نوشاہ اور موٹروں میں بیٹھے ہوئے اور لوگ کر بھی کیا

سکتے تھے، اسے اٹھا کر اسی دم ہسپتال لے گئے۔ زخمی کو فی الفور آپریشن روم میں لے جایا گیا، باہر کمرے میں سب لوگ بیٹھے ہوئے سوچنے لگے، آہ بے چارے کو بہت چوٹ آئی ہے، وہ کیوں موٹر کے نیچے آگیا؟ وہ کون ہے؟ کیا وہ بچ جائے گا؟ آخر ایک لمبے عرصے کے بعد ڈاکٹر باہر آیا اور نوشاد سے کہنے لگا "آخری لمحوں پر ہے تمھاری مسز کو بلاتا ہے"

گل فروش میز پر لیٹا ہوا تھا۔ چھاتی پر پٹی بندھی تھی جو خون سے سرخ ہو چکی تھی، لڑکی کو دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے لڑکی کی جانب اپنا داہنا ہاتھ بڑھایا۔ آہ! اس ہاتھ کی لرزتی ہوئی انگلیوں نے اسی موتیا کے ٹکٹ کو تھام رکھا تھا۔ ٹکٹ خوا آلود تھا، پھول والے نے اپنے پھولوں کے ساتھ خون کی ہو کھیلی تھی۔ کس لئے؟ کیا اس ملاقات کے لئے؟! ——— بے وقوف گل فروش!

لڑکی نے ایک قلیل وقفہ کے لئے گل فروش کی طرف د گل فروش کا سر اس کی چھاتی پر جھک گیا اور لڑکی نے دونوں

بڑھا کر مکٹ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا، جیسے کوئی کسی معصوم یتیم بچّے کو اپنی گود میں لے لے۔ گل فروش کا بازو آہستہ سے میز پر گر گیا۔ اس نے اپنی روح کی پوری قوت سے لڑکی کی طرف دیکھا، پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں، شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسّم نمودار ہوا یہ چراغ سحری کی جھلملاتی ہوئی لو تھی۔

گل فروش کا اکھڑا ہوا سانس مدھم ہوگیا۔ ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا، گل فروش کے لب کانپے، ہلکی ہلکی ایک دو ہچکیاں آئیں۔

چراغ بجھ گیا!

لڑکی رونے لگی۔

"یہ کون تھا؟" ڈاکٹر نے آہستہ سے پوچھا

کوئی اس کے نام سے واقف نہ تھا ...... ارشاد روتی ہوئی دلہن کو بازوؤں میں تھام کر باہر لے گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے شانوں کو ایک خفیف سی حرکت دی اور نرس سے بولا "دوسرا مریض لاؤ!"

دنیا کے اس بھرے ہسپتال میں یہی ہوتا ہے۔ جب ایک مریض

مرجاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ فوراً آجاتا ہے۔

اس حادثے کے چند دنوں بعد گل فروش کا چھوٹا بھائی، اپنی دکان پر (انارکلی کے سرے کے قریب) توتلی زبان میں گجرے اور پھول بیچ رہا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ کی انگلی پکڑے ہوئے اسے نہایت دل آویز لہجے میں مجبور کر رہی تھی کہ وہ اسے ننھے گل فروش کی دکان سے چنبیلی کے پھولوں کے دو ننھے آویزے خرید دے ٭

V. Goal

End is well

زبان جاوداں اس ننھی پر

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہو گی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر، سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے نہ چھاؤں، سخت کھُردرے تنے اور ٹہنیوں پر گِدھوں کے جُھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف، سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے۔ اور اب اس پر کول تار بھی بچھی ہے، جس کی عجیب سی بُو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، برادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو، شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں ——— مگر نام گنانے سے کیا فائدہ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں، کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا، متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں کے قریب ہی ہے اٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لا کالج کے پاس ہی ہے بس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام کچہریوں سے لے کر لا کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا، اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھاپن بدستور موجود ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی کیا پروا ہے، اور یہ ہے بھی سچ اسے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سیکڑوں، ہزاروں انسان گھوڑے گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور پیچھے

کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسی پہلے روز تھی۔ جب ایک بورشین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان تو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ہی، اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک دن بھی پیدا نہیں ہوئی۔

"ہائے بابو، اندھے محتاج، غریب فقیر پہ ترس کر جاؤ رے بابا رے بابو، خدا کے لئے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا، ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب جی میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں، ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پہ"

بیسیوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسہ دے دیتا ہے۔ کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے، کوئی گالیاں

دے رہا ہے، حرام زادے، مسٹنڈے، کام نہیں کرتے۔ بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بے کاری، بھیک،

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شان دار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آ گیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہ رہا ہے اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے، اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے،

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سستا رہا

ہے گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں، پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی سیٹی، اور تانگے والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا نام ہے تیرا کردوں چالان؟ ہجور، "ہجور کا بچہ! چل تھانے، ہجور؟ یہ تھوڑا ہے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔

تانگے والا تانگے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک "گو۔ہ" آ رہا ہے۔ سر پہ ٹیڑھی ٹوپی ہاتھ میں بید کی چھڑی، رخساروں پر پسینہ۔ لبوں پہ کسی ٹرانس کا منتر۔

کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ۔

آٹھ آنے صاب۔

دل، چھ آنے

نہیں، صاب

کیا بکتا ہے، ٹم .....

تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے، پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں، پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے، حرام زادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے۔ لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سنسان ہے۔
شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ کچہریوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کر رہے ہیں۔
بھیّا بھرتی ہوگیا
ہاں
تنخواہ تو اچھی ملتی ہوگی
ہاں
بڑھئو کے لئے کما لائے گا۔ پہلے بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی۔
سنا ہے، جنگ شروع ہونے والی ہے۔
کب شروع ہوگی؟
کب؟ اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم گریب ہی تو مارے جائیں گے۔
کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر۔
ننھّا کیسا ہے؟
بخار نہیں ٹلتا، کیا کریں۔ اِدھر جیب میں پیسے نہیں ہیں اد

حکیم سے دوا ——————

بھرتی ہو جاؤ

سوچ رہے ہیں

رام رام

رام رام

پھٹی ہوئی دھوتیاں ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم، یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حریت۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں، پیٹ، بھوک۔ بیماری، پیسے۔ حکیم کی دوا۔ جنگ

قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، اپلوں کے ٹوکرے اٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے،

"بیٹی ذرا ٹھہرتو" بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں اس کی چال مدھم ہے۔ اس کے لہجے میں بے کسی ہے۔

بیٹی، ہیں، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی ..... میرے اللہ!

اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تُو تو باولی ہوئی ہے، اچھا بیٹی، اچھا بیٹی۔

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔

بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اُپلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے، کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا، کوئی اُسے ایک لمحہ سستانے نہیں دیتا، وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے اسکی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اس کی جھریوں میں غم ہے اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی!

تین چار نوخیز لڑکیاں۔ بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے۔ باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں۔

بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں،
بہن، آج لارنس گارڈن چلیں۔
بہن، آج انارکلی
ریگل؟
شٹ اپ یُو فُول

آج سڑک پر سرخ علوان بچھا ہے، آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی

ہیں، جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کی آمد ہے جبھی تو سکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں، ان کے چہرے دھوپ کی حدّت سے تمتما اٹھے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب اُستاد اُنھیں کان سے پکڑ کر اٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی، استاد اسے گھور کر کہہ رہا ہے۔ او شفی، پگڑی ٹھیک کر، پیارے لال کی شلوار اُس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ "تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال!"

"ماسٹر جی۔ پانی"

پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے۔

دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ۔

ماسٹر جی، پانی،
ماسٹر جی، پانی،
ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے۔

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے وہ ادھر اُدھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ لڑکو ہوشیار ہوجاؤ۔ دیکھ جھنڈیاں اس طرح ہلانا، ابے تیری جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہوجا، بدمعاش کہیں کا،..... سواری آرہی ہے، موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی۔ سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے۔

بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا، لڑکوں کی جان میں جان آگئی ہے۔ اب وہ اچھل اچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں۔ ریوڑیاں۔ گرم گرم چنے، حلوا پوری نان، کباب،

ایک خوانچے والا ایک طرے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے "آپ نے میرا خوانچہ اُلٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ تین روپے کا نقصان ہوگیا، میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان

کر دیجے تو میں جانے دوں گا۔

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ اس کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے۔ جیسے بیلوں کے منہ پر جب وہ کولھو چلاتے ہیں۔ وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دیئے جا رہا ہے۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے چھکڑے کے آگے جُتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ چھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا گداگر مرا پڑا ہے۔ اس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کے لئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ بے بابا۔

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے، یہ سب کچھ دیکھتی ہے۔ سنتی ہے۔ مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی انسان کے دل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنا میٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو، ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اُس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلّا چلّا کر کہوں۔ میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے، مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔

سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک۔!

بندوالی

وہ دھان کو ٹنے والی تھی اور بند کے اس پاس رہتی تھی میں
ی ۂوس بوٹ کی چھت پر بیٹھ کر اسے دیکھا کرتا تھا۔ اس واقعہ کو
م وبیش تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اور بڑے بھائی
ان اور بھابی جان پہلی دفعہ سری نگر آئے تھے۔ ڈاکٹروں
نے بھابی جان کے خون کا دباؤ خطرناک طور پر زیادہ بتایا تھا۔ اور
بیوں میں کشمیر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمیں یہاں آئے
ًتقریبا ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ مگر اب تک میں اس کے نام سے
ا واقف نہ تھا۔ ہر روز اسے چھت پر سے دیکھتا تھا اور ہر روز
ھان کو ٹنے میں مصروف پاتا۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود
ری آنکھیں چار ہوہی جایا کرتی تھیں۔ کشمیری حسن یوں بھی تو

بہت مشہور ہے۔ مگر اس لڑکی میں ایسی عجیب دل کشی، بانکپن اور دل آویزی تھی کہ کچھ بیان ہی نہیں کرسکتا۔ یوں تو اس کے ہاتھ اور ٹخنے عموماً میلے ہوتے تھے۔ اور لباس بھی بوسیدہ اور جابجا سے تار تار لیکن اس کے بے داغ حسن کی فراوانی نے افلاس کی کم مائگی اور بے چارگی کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے حسن میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھچا چلا جاتا تھا — یہ نہیں تھا کہ میں ہی اُسے ہر وقت دیکھتا تھا۔ وہ بھی کسی وقت جب میں کوئی ناول، پڑھنے میں مشغول ہوتا۔ یا غروب آفتاب کے وقت دریا میں تیرتے ہوئے شکاروں کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیا کرتی اور پھر جب یکایک ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے ملتیں تو وہ کسی قدر شرما جاتی۔ اٹھا ہوا سر آہستہ سے اوکھلی میں گر جاتا اور لانبی لانبی پلکیں شرمگیں رخسار پر چھو جاتیں۔ ہر روز اسی طرح نظارہ بازی ہوتی تھی۔ میں خوش تھا اور دل میں سمجھتا تھا کہ اس راز سے اور کوئی آگاہ نہیں۔ اس ایک روز مجھے بہت حیرانی ہوئی جب میرے نوکر رحمن نے مجھے آکر کہ بھابی جان پوچھتی تھیں کہ یہ سامنے بندوالی لڑکی ہر وقت اوپر کیو دیکھتی رہتی ہے —— اور یہ کہہ کر کم بخت مسکرا دیا

لگا۔معلوم نہیں سچ کہتا تھا یا جھوٹ ۔مگر مجھے بھابی جان سے پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ میں سیر سے واپس آرہا تھا کہ بند کے اُس طرف جہاں خیالاں اور شاہ بلوط کے بڑے بڑے گھنے اور قدآور درخت کھڑے ہیں وہ مجھے یکایک مل گئی اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔خوب بنی ٹھنی تھی۔ ایک تنگ نیلے رنگ کا پیرہن پہنے تھی جو اس کے تناسب اعضاء کو اچھی طرح نمایاں کررہا تھا۔ ٹخنے تو نظر نہیں آتے تھے ۔لیکن ہاتھ آج غیر معمولی طور پر صاف تھے اور بے داغ۔ دودھ جیسی سپید گردن میں لڑیوں میں پروئے ہوئے سرخ منکے نہایت بھلے معلوم ہورہے تھے سرخ و سپید رخسار چمک رہے تھے اور اُن آنکھوں کی نیلی گہرائیوں کو کیا کہوں جنھیں دیکھ کر دل میں کھلے ہوئے، کنول کے پھول یاد آجاتے ہیں۔

——— میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرا کر پوچھا "کدھر جارہی ہو؟"

اس نے شرما کر ہاتھ چھڑانے کی ایک ناکام سی کوشش کی اس کے پتلے پتلے لب کانپے جس طرح پھول کی پتیاں ہوا میں کانپتی ہیں مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی ——— میں اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا

چنار کے درختوں کی طرف لے چلا وہ "نا۔نا" کرتی جارہی تھی اور مجھ سے لپٹتی جارہی تھی،۔

ایک بڑے چنار کے نیچے ہم جاکر بیٹھ گئے۔اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔میں نے اس کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔مجھے تم سے محبّت ہے ما اے بند والی دوشیزہ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے بے شک میں جھوٹ بول رہا تھا۔لیکن میں تو اسے اپنا حق سمجھتا تھا۔یوں بھی تو محبّت میں صداقت خدا نے عورتوں ہی کو ودلیعت کی ہے۔

———— اس نے سحر طراز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور باریک سی آواز میں کچھ کہا مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔وہ کشمیری زبان میں بول رہی تھی بہرحال اس کا لب ولہجہ نہایت دلکش تھا۔

"اِدھر دیکھو"۔میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا "مجھے ——تم —— سے محبّت ہے" میں رُک رُک کر اسے عاشقوں کی زبان میں سمجھا رہا تھا...... میرا......نام......میں نے ہاتھ کے اشاروں سے تتلاتے ہوئے کہا۔میرا نام فیروز ہے۔سمجھتی ہو نا؟ میرا نام فیروز ہے۔ اور......تمہارا......نام......کیا ہے ؟

معلوم نہیں اس نے کیا سمجھا۔وہ جلد جلد اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔وہ نہایت روانی سے اور نہایت فصاحت سے بول رہی تھی

الفت۔جیجی ۔ شوہر۔یہی تین لفظ میری سمجھ میں آئے۔ بولتے بولتے
س کی آواز بھرا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔
میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے ۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
چھ توقف کے بعد میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالنے کی کوشش کی
لکن اس نے جھٹ منہ پھیر لیا اور ——— اور بھی زور سے
ونے لگی۔ وہ ایک معصوم بچے کی طرح رونے پر گویا تلی ہوئی تھی۔
دیکھ کر میں نے بھی اسے بچوں کی طرح گدگدانا شروع کیا۔ اور
تنا گدگدایا کہ وہ روتی ہوئی مسکرا پڑی اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے
ی۔
اب کہو۔میں نے اسے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا پھر روؤ گی؟
یسے وہ میری بات سمجھ گئی،اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔
کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔میں نے آسمان کی
رف دیکھا۔ دُور، کہیں کہیں تارے جھلملا رہے تھے اور چنار کی پھیلی
وئی ٹہنیوں کے درمیان بچارا مہ نو بھی کسی دوشیزہ کے ٹوٹے ہوئے کنگن
طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے
ہے تھے اور ان کے دوش پر شکارے چلاتے ہوئے ہانجیوں
پُر کیف صدائیں لرزہ خیز تھیں۔

میں نے کشمیری دوشیزہ کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھا اپنی باہیں اُس کی کمر میں ڈال دیں کہ اسے اپنی آغوش میں لے لوں۔ اس نے آہستہ مگر مصمم ارادے سے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑا لیا اور سرزنش کے انداز میں مجھ سے کچھ کہنے لگی۔

صرف دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔ گناہ .... گناہ .....

میری جان! میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اگر یہ گناہ ہے تو ہوا کرے۔ یہ گناہ محبّت ہے۔

اس نے تڑپ کر ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور میری طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کچھ کہنے لگی۔ غالباً ملامت کر رہی تھی۔ میں سر جھکائے سُن رہا تھا۔ بے کس و مجبور ہو کر سر جھکائے سُن رہا تھا۔

شاید اسے مجھ پر کچھ رحم آگیا۔ اس نے میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے۔ اور میرے کان میں کچھ پیارے پیارے الفاظ کہہ کر بھاگ گئی۔ چنار اور بلوط کے درختوں میں سے گذرتی ہوئی، یہ جا، وہ جا۔ ایک دم غائب ہو گئی۔

میں کچھ دیر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اٹھا۔ اپنی چھڑی اٹھائی اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

یار تم نرے گدھے ہو۔ گدھے اور احمق اور اُلّو!

دوسرے دن دوپہر کو میں چھت پر چڑھا۔ اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن جانِ آرزو کہیں نظر نہ آئی۔ او کھلی منہ کھولے پڑی تھی۔ اور ساتھ ہی موسل بھی ٹیڑھا پڑا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ نہ دھان کی بوری کہیں نظر آتی تھی، نہ دھان کوٹنے والی میں حیران تھا اور ولکاکس کا ایک ناول گھٹنوں پر رکھے یوں ہی سوچ رہا تھا۔ آج دھوپ کتنی فرحت بخش ہے۔ وہ آج کدھر چلی گئی ہے کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ دریا کا پانی آج کس طرح نیلم کی طرح چمک رہا ہے۔ وہ نیلا پیرہن اسے کتنا بھلا معلوم دیتا تھا۔ اور وہ گلے میں سرخ منکے۔ مگر ہے بہت شوخ و شنگ۔ میں اسے جتنی بھولی سمجھتا تھا۔ وہ اتنی ہی طرار نکلی۔

رحمٰن میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اپنے ابرو استفہامیہ انداز میں اوپر اٹھائے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ آج فرینزی کو خوب مار پڑی۔ فرینزی؟ فرینزی؟ کون۔ فرینزی؟

رحمٰن نے بند کی طرف اشارہ کیا۔ وہی دھان کوٹنے والی۔ فرینزی.... فرینزی..... میں نے آہستہ سے دل میں دہراتے

ہوئے کہا۔ خوب صورت نام ہے۔ فریزی .... فیروز..
فریزی۔ دلکاکس سے تو بدرجہا اچھا ہے۔ اونہہ! دلکا کس
بھی بھلا کوئی نام ہے؟

اور رحمٰن آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ اس کے باپ نے
اس کے بھائی نے اور اس کے ہونے والے شوہر نے اسے خوب
پٹیاکل شام کو پتہ نہیں وہ کدھر چلی گئی تھی اور بہت دیر کے
واپس آئی تھی۔ ان عورتوں کا کیا اعتبار ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن
ہوئے۔ اس کے منگیتر نے اس کے لئے ایک نیلا ریشمی چغہ خرید
تھا کہ وہ اُسے نکاح کے روز پہنے۔ کم بخت وہی نیلا چغہ پہن
کر کہیں چلی گئی۔ گویا کہیں اپنا بیاہ رچانے جا رہی تھی۔ ان عورتوں
کیا اعتبار ہے۔ مگر آج پٹی بھی خوب ہے۔ عمر بھر یاد رکھے گی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں نے گرج کر کہا۔ "دُور ہو جاؤ یہ
سے۔ میں نے تم سے کب کہا ہے کہ فریزی اور اس کے منگیتر
قصّے یوں مجھے آکر سناؤ؟" یہ کہہ کر میں نے کتاب کو
سے کھولا اور اسے نہایت توجہ سے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

گو میں نے نگاہ اُوپر نہ اٹھائی۔ لیکن بخوبی جان گیا تھا
شیطان میری طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ میں نے اس کی طر

مزید توجہ دینی مناسب نہ سمجھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس کے واپس چلے جانے کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو سامنے فرنیری کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں دھانوں سے بھرا ہوا تھیلا پکڑے تھی اور دوسرے ہاتھ سے بار بار آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ ہاں وہ رو رہی تھی اور مجھے دیکھ کر اور بھی زور زور سے رونے لگی میں نے پریشان ہو کر اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ یہ لڑکی تو مجھے مفت میں بدنام کرے گی۔ میں بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں کم بخت روئے جاتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ کتنی اجڈ ہے اور گنوار۔ کس طرح میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے اور روئے جاتی ہے۔ مجھے نیچے ہی چلنا چاہئے۔ میں اپنے دل میں اپنی غلطی پر پچھتا رہا تھا۔ اور اس بے وقوف لڑکی کو کوس رہا تھا۔

میں نے کتاب اٹھائی۔ کرسی کو تہ کیا اور اسے بازو میں لٹکائے ہوئے فرنیری کی طرف نگاہ کئے بغیر نیچے اُتر گیا۔ نچلی منزل میں زینے کے قریب بھابی جان کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں نیچے اُتر آئے ہو۔ دھوپ تیز ہو گئی ہے؟ میں نے جلدی سے کہا" اور سر میں ہلکا سا درد بھی محسوس کرتا ہوں"۔ تمام دن بستر پر لیٹا رہا۔ اور پھر جتنے دن سری نگر میں رہا کبھی چھت پر نہیں گیا۔ سات آٹھ روز اسی طرح

رہنے کے بعد میں نے بھائی صاحب سے صاف کہہ دیا کہ میرا تو اب یہاں دل نہیں لگتا۔

"واپس شجاع آباد چلے جاؤ"

"بہت اچھا" میں نے کہا۔ اور دوسرے ہی دن سری نگر سے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

اتنا کہہ کر فیروز خاموش ہوگیا اور ہؤس بوٹ کے ڈرائنگ روم کے دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔

بس؟ میں نے آہستہ سے پوچھا مجھے غیر محسوس طریقہ پر یقین ہوگیا تھا کہ داستان کا دلچسپ حصّہ ابھی باقی ہے۔ اس لئے کچھ توقف کے بعد میں نے پھر استفسار کیا۔ بس؟

فیروز نے آہستہ سے ایک سگار سلگایا۔ ایک دو کش لگائے اور دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہوئے رک رک کر کہنے لگا

نہیں ..... تو .... اچھا ..... بقیہ بھی سن لو۔

گھر پہنچ کر بھی میرا دل نہ لگا۔ ہر وقت پریشانی سی رہتی تھی اور دل میں ہر آن کچھ عجیب سی بے چینی اودیے کلی پاتا تھا۔ کچھ عجیب

ی حالت تھی کہ جس کا ہر بار تجزیہ کرنے پہ بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔
بھی سوچتا میں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ کبھی سوچتا۔ میں نے
کچھ کیا موقع و محل کے مطابق وہ ٹھیک تھا اور اگر ایسا نہ کرتا
شاید۔ اس گنوارن کے لئے اپنی آبرو مٹی میں ملا لیتا۔ اور پھر
یکایک اس گنوارن کا بھولا بھالا روتا ہوا چہرہ سامنے آجاتا
ل میں ایک کسک سی ہوتی اور میں بے اختیار اپنے آپ کو
لامت کرنے لگتا پھر اپنے آپ کو تسلی دیتا۔ میں نے آخر کیا
ی کیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ میں نے ہرگز کوئی گناہ نہیں
کیا۔ کم از کم اس معاملے میں تو میرا ضمیر صاف ہے۔ مگر پھر وہی
روتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا اور ان نیلی آنکھوں
سے بہتے ہوئے طوفان کے آگے میری سب عقل تسلیاں ریت کی
دیوار کی طرح بہ جاتیں۔

اسی طرح ڈیڑھ ہفتہ اور گزر گیا۔ خزاں آئی اور خزاں کے
ساتھ ہی بھائی صاحب اور بھابی جان بھی سری نگر سے آگئے۔ میں
سٹیشن پر انھیں لینے گیا تھا۔ بھابی جان اب بالکل اچھی ہوگئی تھیں
ان کے بشاش اور پُر رونق چہرے کو دیکھ کر ایک لمحے کے
لئے مجھے بہت مسرت ہوئی دوسرے لمحے ہی نہ جانے کیوں

میں اداس ہو گیا۔ آدمی کی نفسیاتی زندگی میں پروازِ خیال بھی عجیب چیز ہے۔ بھابی جان کو دیکھتے ہی فرنیری یاد آگئی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے میں صاف اور واضح طور پر فرنیری کے ملول چہرے۔ اور اندوہگیں آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ یا شاید یہ سب واہمہ ہی تھا۔ بھائی صاحب نے میرا چہرہ یکایک اترا ہوا دیکھ کر کہا۔ کس سوچ میں پڑے ہو؟

کچھ نہیں میں نے آہستہ سے کہا اور ہم موٹر میں بیٹھ کر گھر آگئے۔

شام کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سفر کی باتیں اور سری نگر کی باتیں۔ سن مرگ اور پہلگام کے مناظر، کسٹم والوں کی بے ضابطگیاں۔ زعفران کے کھیت اور ڈرائیور کی بدمستیاں۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے بھائی صاحب آنکھیں جھپکنے لگے۔ سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ میں بھی اٹھ کر خواب گاہ میں چلا آیا۔

خواب گاہ کے اندر رحمٰن بستر جھاڑ رہا تھا۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے رکا۔ پھر بستر جھاڑتے ہوئے کہنے لگا

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ ہُوس بوٹ کی چھت پر کسی کو ڈھونڈا کرتیں اور پھر وہ اسی طرح تکتے تکتے بے اختیار ہو کر رونے لگتی" میرے دل پہ ایک تیر سا لگا۔ آہ! وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔۔۔۔ ایک دوشیزہ کی پہلی والہانہ محبت" اس کے ماں باپ نے اسے بہت سمجھایا بجھایا اور آخر تنگ آکر اس کی شادی کر دی"

"ارے" میں نے چونک کر کہا۔

شادی سے ایک روز پہلے وہ میرے پاس آئی۔ رحمان نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہی نیلا ریشمی جبہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رو رو کر اس کی آنکھوں کے چشمے سوکھ گئے ہیں اور چلا چلا کر اس کے گلے میں آواز کی قوت باقی نہیں رہی" وہ کدھر گئے ہیں" اس نے کھوکھلی سی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"وہ گھر واپس چلے گئے ہیں" میں نے جواب دیا۔

اس پر وہ چیخی نہ چلائی۔ گردن جھکا کے چپ چاپ دیر تک کھڑی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"وہ کب آئیں گے؟"

مجھے اس پر رحم آ رہا تھا ریشمی چغہ پہنے ہوئے بھی وہ کس قدر غریب معلوم ہو رہی تھی ۔ غریب اور بے کس ۔ کتنی بے چارگی اس کے لہجے میں تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں مصائب و آلام کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہیں وہ گردن جھکائے کھڑی تھی اور میرے جواب کی منتظر تھی اس کے پھول سے رخسار جو کبھی سیب کی طرح سرخ تھے ۔ آج برف کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے ۔ بس موم کی گڑیا معلوم ہوتی تھی ۔ کاش میں اسے تسلی دے سکتا ۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا کہ میں اس کی آس بندھا سکتا اور اس کے زرد زرد چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑا سکتا ۔

یہ کہہ کر رحمٰن کچھ دیر چپ رہا ۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا ۔

دوسرے روز اس کی شادی ہو گئی ۔ شادی کے تیسرے روز وہ اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی ۔ اس نے زہر کھا لیا تھا ۔

فیروز خاموش ہو گیا ۔ ہمارا شکار اڈول میں داخل ہو چکا تھا ہانجیوں کے چپوؤں کی رفتار سست پڑ گئی تھی ۔ وہ نہایت نرم اور

پُرسوز لے میں چپوؤں کی آواز کی تال پر گا رہے تھے۔

میرے پیارے آ تیرے باغ میں بہار آئی ہوئی ہے۔

میرے پریتم آ۔ آ کہ تیرے درخت، پھلوں سے لدے پڑے ہیں۔

میرے پیارے آ کہ پھولوں کی بہار کا زمانہ میں نے کاہشِ انتظار میں گذار دیا۔

میرے پریتم جلد آ، کہیں اس بہار کو خزاں کا دلیہ نہ چٹ کر جائے۔

"اور بس میری کہانی بھی یہاں ختم ہوتی ہے" فیروز نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لبوں پر ایک یاس انگیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی وہ کشتی کے پہلو پر جھک گیا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہ دو دیکھتے ہو نا۔ وہ جوڈل کے اس طرف چنار کے درخت ہیں۔ وہاں اس کنج میں سبز سبز گھاس کے نیچے میری فرنیری محوِ خواب ہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد وہاں چلو گے۔ ارشد بھائی"!

دور، بہت دور ایک مانجی اپنی کشتی کو کنارے پر لگا رہا تھا گانے کی آواز نے شاید اسے بھی متأثر کر دیا تھا۔ فضا کی خاموشیوں کو چیرتی ہوئی۔ پانی کی لہروں سے ٹکراتی ہوئی۔ اس کی سریلی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

آہ - میرے پریتم! تیرے باغ میں بہار آئی اور چلی بھی گئی -
آہ میرے پیارے! تیرے درختوں پر پھول کھلے اور مرجھا بھی گئے -
آہ - میرے پریتم! درختوں کے پتے تیرے انتظار میں زرد ہو گئے اور ان پر برف ایک سفید دیو کی طرح چھا رہی ہے -
آہ - میرے پیارے! تو اپنے خزانے کو یوں لٹتا ہوا چھوڑ کر پردیس کیوں جا بسا؟

میں نے اس کا ہاتھ زور سے دبا دیا - میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے - ہم دونوں پردہ اٹھا کر باہر دیکھنے لگے -

ڈل کی نیلی نیلی لہروں پر آفتاب کی آخری کرنیں لرزاں تھیں - ہوا میں پھولوں کی بو بسی ہوئی تھی - ہمارے اردگرد کنول کے پھول تیر رہے تھے اور ان کی نازک پتیوں پر پانی کے قطرے ٹکے ہوئے تھے کسی کی پلکوں پر آنسوؤں کی طرح - اور شفق کی ارغوانی روشنی میں چمک رہے تھے کسی کے گلے میں سرخ منکوں کی طرح +

واہ رے بزدل - خوب بھاگ [illegible]
تم بھی عجیب احمق ہو - [illegible]
[illegible] آتا -

ویکسی نیٹر

جب میں ایف۔ اے میں فیل ہو کر اس گاؤں میں وکیسی نیٹر بن کر آیا تو وہ چیز جس کی کشش نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا ریشماں تھی۔ ریشماں کے حسن و جمال کا چرچا تو میں اس سے پہلے بھی بہتوں سے سن چکا تھا، اور خاص کر راستے میں ایک پولیس سارجنٹ نے جب اسے معلوم ہوا کہ میں پنڈورہ کے گاؤں میں وکیسی نیٹر بن کر جا رہا ہوں مجھے بتایا کہ "پنڈورہ کی دلکش وادی میں یوں تو بہت سی چیزیں اور جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ لکشمن جی کا کنڈ۔ جس کی گہرائی کا پتہ آج تک کوئی انگریز بھی نہیں لگا سکا۔ جاگیردار صاحب کا پرانا محل جس کے چوکور برج دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہیں، اور جو آج کل ویران پڑا ہے اور صرف

اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے جب جاگیردار صاحب یا ان کے مہمان یا لڑکے بالے کبھی پنڈور کی وادی میں شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ کھٹے اناروں کا جنگل، جو پنڈور کے مغربی پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے اور جہاں جنگلی ملنگ، سیب، آڑوچے بھی اور املوک کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں جنگلی گلاب کی بیلیں کسی محبوب کی باہوں کی طرح ان پھل دار درختوں سے ہر وقت لپٹی رہتی ہیں اور جن کی آغوش میں بنفشے کے پھول ہر لحظہ مسکراتے اور شرماتے ہیں۔ ہاں پنڈور کی وادی میں بہت سی دیکھنے کے لائق ہیں۔ لیکن وہاں اگر تم نے ریشماں کو نہ دیکھا لینا کہ تم نے پنڈور میں کچھ نہیں دیکھا۔"

"سچ مچ" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"خدا کی قسم"———! پولیس سارجنٹ نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہوا۔ لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دل میں گھر کر گیا۔ آخر وہ بھی ایسی کیا حسین پری ہوگی؟ ان پولیس والوں کی باتوں پر اعتبار کم ہی کرنا چاہئے، اور پھر عورتوں کے متعلق تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے، چاہے

وہ مٹی ہی کی کیوں نہ ہو۔

اب تو میری حالت اس بوڑھے مرغ کی سی ہے جو شباب گزر جانے پر بھی اپنے آپ کو جوان ہی سمجھتا ہے۔ لیکن ان دنوں جب میں نیا نیا وکیسی نیٹر بن کر یہاں آیا تھا تو میری شکل وشباہت بہت سے لوگوں کے لئے قابل رشک تھی۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان دنوں گاؤں بھر میں میں ہی اپنے ڈھنگ کا ایک سجیلا جوان تھا اور پھر انٹرنس پاس اور سفید لٹھے کی شلواریں پہننے والا، گیارہ روپے تنخواہ تھی، کلاہ پر طرّے دار لنگی، پاؤں میں کام دار جوتی اور چہرے پر مونچھیں سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی۔ ہاں وہ زمانہ تھا میرے بانکپن کا، اب تو جوانی کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

آہ، دوست وہ بھی کیا دن تھے، کاش تم نے مجھے جوانی میں دیکھا ہوتا۔ دیوان غالب میں ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، وہ ہے۔ وہ ہے ..... آہ، اس وقت کم بخت یاد نہیں آ رہا۔ دماغ چکرا... بان پہ آ رہا ہے، لیکن ——— اچھا۔

ہاں، تو میں ریشماں کے متعلق کہہ رہا تھا۔ لیکن میں ریشماں کے متعلق کیا کہوں،

ریشماں کی آنکھیں ، ان نیلی پتلیوں کی اتھاہ گہرائیاں ، وہ آنکھیں ان دو پاک وصاف جھیلوں کی مانند تھیں جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پہ واقع ہوں ، جہاں کسی انسان کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں ریشماں کے نازک لب ، شرمسار ، محجوب سے لب ۔ جیسے وہ اپنا خوب صورتی پہ خود ہی پشیمان ہوں ، اس کے نازک ہاتھ ۔ مرمری انگلیوں کی پوریں ۔ جنگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین ۔ اس کی چال جیسے دوشیزۂ بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوا کے دوش پہ اٹھلاتی ہوئی آگئی ہو ۔ اس کی آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریئے کی بنسری کی طرح میٹھی اور ابلتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لوچ دار ۔ اس کا قد! فارسی کا ایک شعر ۔ ایک نہایت ہی موزوں شعر ہے ۔ لیکن ...... کم بخت یاد نہیں آرہا ، بالکل زبان پہ پھر رہا ہے ۔ آہ ، کیا خوب شعر تھا ، نظیری کا شعر ، نہیں عرفی کا ، آہ ، اب حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے ۔ کچھ نہیں رہتا ——— کچھ یاد نہیں رہتا ، مجھے اب تو اپنا کلام بھی یاد نہیں ، حیرت ہے ، ان دنوں میرا حافظہ کس قدر تیز تھا ۔

تو یہ تھی ریشماں ، پنڈور کی وادی کی حسینہ بے شک ایک نایاب چیز تھی اور لوگ دُور دُور سے اسے دیکھنے کے لئے آیا کر

تھے ۔ اس کے باپ کو ہر روز ریشماں کے ناطے کے لئے پیغام آ یا
رتے ۔ کوئی پانچسو روپے ، کوئی ایک ہزار، کوئی ڈیڑھ ہزار اور کوئی
ن چلا تین ہزار روپے تک دینے کو تیار تھا ، لیکن اس کا باپ
ایذ صرف نفی میں ہی جواب دینا جانتا تھا ۔ کم ازکم میں نے تو اسے
سی سے ہامی بھرتے نہیں دیکھا نہ سنا ، خدا جانے اس کے دل میں
یا تھا ۔ شاید وہ اپنی لڑکی کو کسی بادشاہ کے ہاں دینا چاہتا تھا ۔
ریوں بھی تو ریشماں کسی بادشاہ کے گھر کے ہی لائق تھی ۔

لیکن ، جیسا کہ میں نے کہا ، جوانی بڑی بلا ہے ۔ اور جوانی کی محبت
سے بھی زیادہ خطرناک ، میں نے ریشماں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ دنیا
ں ریشماں صرف میرے لئے ہے ، اور میں اس کے لئے ، اور یہ ٹھان
ی ـ کہ چاہے اس کے باپ کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے ، اسے
ڑا ہی کیوں نہ کرنا پڑے ، لیکن اگر شادی ہوگی تو صرف ریشماں سے ،
یں نوجوان پر کھیل جاؤں گا ، اس کے سارے خاندان کو تہ تیغ کردونگا
ارے گاؤں کو آگ لگا دوں گا ، اس کے سامنے پہاڑی پر سے نیچے
ے میں کود کر مرجاؤں گا ۔ لیکن یہ کبھی گوارا نہ ہوگا کہ میرے جیتے
جی میری ریشماں کو کوئی اور شخص چاہے وہ جاگیردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو
یاہ کرلے جائے ۔ جوانی میں آدمی کیسی کیسی عجیب باتیں کرتا ہے ۔ بیوقوفوں

کی سی باتیں ۔فضول ۔خطرناک ۔ عاقبت نا اندیشیاں ،

تو صاحب ! میں نے ریشماں کی محبت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی لوگوں کو ٹیکہ ویکہ لگانا کیسا ؟ ہر وقت ریشماں کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا ، پاگل کتے کی طرح ، وہ چشمے پہ پانی بھرنے جاتی ، تو مجھے پہلے ہی موجود پاتی ۔ چرواہوں کے ساتھ جنگل جاتی ، تو میں بھی اپنی توڑے دار بندوق لئے ہوئے جنگل میں آموجود ہوتا ۔ میں ان دنوں گانا بھی اچھا جانتا تھا ، میرا مطلب ہے کہ میں ماہیا بہت مزے سے گایا کرتا تھا اور اکثر لوگ میرے ماہیا گانے پہ بہت خوش ہوتے تھے ۔ کہتے تھے مراثی بھی اتنا اچھا ماہیا نہیں گا سکتا ۔ لیکن اب وہ دن [redacted] تو دن میں مجھے دس بار کھانسی کی شکایت ہوتی ہے ۔ تم شہر میں رہتے ہو ۔ کبھی کوئی اچھی سی دوا ہی بھیج دیا کرو ۔ ورنہ تمہارے شہر میں رہنے سہنے کا ہمیں کیا فائدہ ، کیوں ؟ . . . . . .

خیر . . . . . ایک دن کی بات ہے میں کسی قریب کے موضع سے چیچک کے ٹیکے لگا کر واپس آرہا تھا ۔ شام ہو چکی تھی اور مغرب سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی ، میں بہت مغموم تھا ۔ کیونکہ دن بھر میں گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے ریشماں کے دیدار سے محروم رہا تھا چنانچہ بہت ہی حزیں لہجہ میں آہستہ آہستہ ع

"فراقِ جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے"

گاتا ہوا چلا آ رہا تھا، میں اس وقت بہت اداس تھا، میری آنکھیں
نا ید اُس وقت آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں، اور مجھے اپنے آپ
بہت خیال آ رہا تھا۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے راستے
یں ایک خوبانی کا درخت آتا ہے۔ چنانچہ جب میں اس خوبانی
کے درخت کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تنے کا سہارا لئے
پنی سنہری کاکلوں کو اپنے نازک شانوں پہ پریشان کئے ریشماں
ڑی میری راہ تک رہی ہے۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے چند صدیوں کی طرح گذر گئے۔ پھر ریشماں بولی اپنی نیم
ٹھی آواز میں:۔ "جی آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟" میں نے
کہا "اس لئے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں، اور تمھیں دیکھے بغیر نہیں
رہ سکتا۔"

ریشماں بولی "جی، مجھے سب سہیلیاں طعنے دیتی ہیں" اور پھر اس
ح آپ کا میرے پیچھے پیچھے پھرنا ٹھیک نہیں، میں آپ کو گالیاں
ں گی، تو پھر آپ ......"

میں نے کہا "تو میں نے کب منع کیا ہے۔ آپ شوق سے گالیاں
۔ میں انھیں سنتا جاؤں گا۔ اور پھر انھیں اکٹھا کر لوں گا۔ پھول

کی طرح پھر ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں پہن لوں گا۔

ریشماں بولی :" ہم ٹھیریں ان پڑھ۔ بھلا ہمیں آپ کی طرح باتیں بنانا کہاں سے آئیں۔ لیکن میں آپ سے پھر کہتی ہوں، خدا کے لئے آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں۔ ابا آپ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں، کہتے تھے۔ اگر وہ لڑکا باز نہ آیا تو اسے قتل کروا لیں گے۔"

میں نے سر جھکا کر کہا :" یہ سر حاضر ہے۔ ابھی گردن اڑا دیجئے اگر اُف کر جاؤں تو ......"

ریشماں نے ایک عجب ادا سے سر ہلا کر کہا :" ہائے، میں یہ کب کہتی ہوں کہ آپ مر جائیں، لیکن آخر .... آپ چاہتے کیا ہیں؟"

" میں کچھ نہیں چاہتا" میں نے اپنا ہاتھ اپنے کلیجے پر رکھ کر کہا " ہاں، صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تم یہاں سے چلی جاؤ تو تمھارے پیارے قدموں کی خاک اپنے ماتھے سے لگالوں، اور تمھارا نام لیتا ہوا اسی دم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔"

ریشماں مسکرائی۔ ایک لڑکی کی طرح نہیں، بلکہ ایک عورت کی طرح مسکرائی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ کے لئے مجھے دیکھا۔ پھر وہ پلکیں گلاب کے پھولوں کی طرح خوشنما اور نازک گالوں پر جھک گئیں

دوسرے لمحہ ہنستے ہوئے وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ بھاگتی جاتی تھی اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی۔

چند لمحے تو میں چپ چاپ پتھر کے بت کی طرح ساکن کھڑا رہا پھر میں نے بھی ریشماں کے پیچھے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا، وہ ایک ہرنی کی طرح تیز بھاگ رہی تھی۔ اس کے منہ سے ہنسی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پہ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔

اب میں اس کے بالکل قریب آگیا تھا لیکن ابھی اسے چھو نہیں سکا تھا۔

وہ اب زیادہ تیزی سے بھاگنے لگی۔

لیکن میں اب اور بھی قریب آگیا تھا اور ہمارے درمیان بالکل تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔

"دیکھو، ہمیں ..... ہمارا پیچھا مت کرو ..... میں ہنستی ہوں یہ اچھا نہیں ....."

ایک چھلانگ لگا کر میں نے اسے جا دبوچا اور آغوش میں اٹھا لیا۔

اب کدھر جاؤ گی؟"

"مجھے چھوڑ دو ..... مجھے چھوڑ دو ..... میں گھر جاؤں گی"

اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

میں ایک چنار کے درخت کے قریب جا کر رُک گیا اور اسے سبز روِش پر آہستہ سے گرا دیا، اور پھر اس کے قریب ہی سستانے کے لیے بیٹھ گیا۔

"دیکھا تم نے؟" تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں، میں نے ہنس کر کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی اور اپنے پریشان بال درست کرتی رہی۔ ہم گاؤں سے بہت دور نکل آئے تھے، شفق گم ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ندی کا پانی ایک چاندی کے تار کی طرح چمک رہا تھا، اس پہاڑوں پر اب جنگل دکھائی نہ دیتے تھے۔ اندھیرے کی سیاہی میں غائب ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں تارے بھی نکل آئے تھے۔

میں نے ریشماں سے پوچھا "تم مجھ سے کب نکاح کرو گی؟"

"کبھی نہیں!"

"وہ کیوں؟"

"تم نیلی ہو، ہم مغل ہیں" ریشماں نے شوخی سے کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے ریشماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"ہرگز نہیں!"

"تو پھر تم میرے پاس کیوں بیٹھی ہو؟"

جواب میں ریشماں نے میری طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر یکایک کسی خیال کے زیر اثر وہ کانپ اٹھی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔

"میں آج خوب پٹوں گی۔ ابّا مجھے ڈھونڈھ رہے ہوں گے لیکن یہ کہہ تو آئی تھی کہ میں خالہ کے ہاں جا رہی ہوں، لیکن اب دیر بھی تو بہت ....."

میں نے قطع کلام کرکے کہا۔ "تجھ ایسی شریر لڑکی اسی لائق ہے کہ اسے خوب پیٹا جائے۔"

ریشماں بولی "میں جانتی ہوں، تم مجھے کبھی نہیں پیٹو گے"

میں نے کہا "ہاں، کیونکہ میں ایک تیلی ہوں اور تم مغلزادی ہو"

ریشماں نے اپنا نازک ہاتھ میرے کندھے سے لگایا۔ پھر بے اختیار اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

"تم کتنے ناشکرے ہو" اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یکایک آسمان کے ستارے کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں اور چاند کی روشنی میں سفید سفید بادلوں کے کانپتے ہوئے

نازک سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیرِ اثر ناچنے لگے ہیں اور معزلی ہوا کے جھونکے چنار کے پتوں میں چھپ چھپ کر غیرفانی زندگی کے گیت گا رہے ہیں۔ میں نے ریشماں کی لمبی لمبی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ یہ خوشی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگی اور جب میں نے دفورِ شوق سے بے اختیار ہوکر اپنے لب اس کے لبوں پہ رکھ دیئے تو مجھے معلوم ہوا کہ ان ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی سی مٹھاس ہے اور دہکتے ہوئے انگاروں کی سی گرمی اور جلن دونوں ہی احساس تھے، ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک جاں بخش اذیت۔

اس کے بعد آٹھ دس دنوں کے کوائف میں تمہیں اچھی طرح نہیں بتاسکتا، کچھ یاد نہیں آتا، زندگی ایک دل خوش کن خواب کی طرح گزر رہی تھی، جس میں میں اور ریشماں ہی تھے۔ کچھ عجب سی حالت تھی۔ شراب کا سا نشہ۔ دلفریب نغموں کا سا سرور۔ سارا گاؤں جنت نظر آتا تھا اور دور سے جاگیردار صاحب کے پرانے محل کے برج سونے کے کلسوں کی طرح چمکتے تھے۔ عجیب اور پُراسرار، مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تمام دنیا، قدرت کی رعنائیاں۔ پرندوں کے چہچہے بے فکر گڈریوں کے قہقہے۔ ہمارے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ میرے اور ریشماں کے لئے، تاکہ شام کے جھٹپٹے میں ہم دونو

چھپ کر اور باہوں میں باہیں ڈال کر گاؤں سے باہر کسی نخلے سے مرغزار میں جا بیٹھیں اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن یہ سب کچھ آٹھ دس دن کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک ظالم وحشی ہاتھ نے ایک پُر زور جھٹکے کے ساتھ میرے دلفریب خواب کو منتشر کر دیا۔ عین اس دن جب ہم دونوں نے گاؤں سے بھاگ جانے کی صلاح کی تھی۔ ریشماں کے ظالم باپ نے اسے جاگیر دار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کر دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بہت دیر سے در پردہ مشورے ہو رہے تھے۔ جاگیر دار صاحب کا بڑا لڑکا بہت اوباش ہے۔ جس طرح بڑے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ ریشماں پر لٹو تھا۔ کہیں شکار کھیلتے آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ بس ریشماں کے باپ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دئیے، ادھر میری بے خبری کا یہ عالم کہ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ ب ریشماں شہر میں جاگیر دار صاحب کے محل میں پہنچائی جا چکی تھی.....

یہ چوٹ اتنی کاری اور ناگہانی تھی کہ میں اپنے حواس برقرار رکھ سکا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد دو سال تک میں پاگل سا رہا۔ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گیا تھا۔ در بدر گھوستا تھا۔ اور لوگوں سے کہتا تھا "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ وہ مجھے کاٹنے کو آ رہی ہے"

بس یہی دو کلمات تھے جو ہر وقت میری زبان پر جاری رہتے۔ سنا ہے کہ ایک دن جب میں جاگیر دار صاحب کے شہر میں گھوم رہا تھا انھوں نے مجھے کہیں دیکھ لیا اور جب کسی مصاحب سے انھوں نے میری رام کہانی سنی تو مجھ پر بہت ترس کیا اور علاج کے لئے شکارپور کے پاگل خانے میں بھیج دیا اور جب میں دو سال کے بعد تندرست ہو گیا تو پھر مجھے اپنے پرانے عہدے پر اسی وادی میں تعینات کر دیا لیکن اس گاؤں میں نہیں بلکہ دور کے گاؤں میں جو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔"

اتنا کہہ کر ویکسی نیٹر چپ ہو گیا، اور حقہ گڑگڑانے لگا، ریشماں نے آہستہ سے پوچھا،

"اور ریشماں؟..... تم نے اسے پھر کبھی دیکھا؟"

"ریشماں جاگیر دار صاحب کے بڑے لڑکے کے حرم میں ہے۔ اگرچہ وہاں عورتیں تو بہت ہیں۔ لیکن ریشماں کو اپنے مالک کی چہیتی ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے، اس کے دو لڑکے بھی ہیں .... میں نے اسے آٹھ نو سال ہوئے، اس کے باپ کے گھر اسی گاؤں میں دیکھا تھا جب وہ اپنے بھائی کی شادی پر یہاں آئی تھی، اس کا باپ، اب کیا بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اس گاؤں کا نمبردار ہے اور علاقے

ڈیلدار - اس کا مکان پتھروں سے بنا ہے - تم نے راستے میں دیکھا تو ہوگا - وہ جس پر ٹین کی چھت ہے اور جس کے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے ...... میں نے اسے اس باغیچہ میں دیکھا تھا، وہ خوب صورت ریشمیں لباس پہنے ٹہل رہی تھی - اس کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے - وہ اب بھی بے حد خوب صورت تھی - اس کی چال شاہزادیوں جیسی تھی - میں دیر تک باڑ کی اوٹ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا - ریشماں جو کبھی میری منکوحہ ہوتی - ریشمیں کپڑوں کی بجائے، وہ سُرخ سوسی کی بھاری شلوار اور چھینٹ کی قمیص پہن کر میرے اپنے بچوں کو لے کر یوں ٹہلا کرتی - یہ سوچ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے - اور انھیں پونچھنے کی کوشش کئے بغیر ہی میں باڑ کی اوٹ سے باہر نکل آیا اور اسے گالیاں دینے لگا، میں نے اسے سخت فحش کلمات کہے - اس کے ماں باپ کو گالیاں دیں، اس کے سارے خاندان کو جی بھر کر اور چیخ چیخ کر کوسا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ٹلا - جب تک لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر اور گھسیٹ کر پرے نہ لے گئے "

"اور ریشماں نے تمھیں کچھ نہ کہا" رشید نے پوچھا،

"نہیں، مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی - پھر اس نے گردن جھکا لی اور چپ چاپ گالیاں سنتی رہی - اس کی آنکھوں کی نیلی

جھیلوں سے آنسوؤں کے چشمے بہ نکلے، اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا .....

بعد میں جب وہ اپنے گاؤں سے چلی گئی تو اس کی ایک پرانی سہیلی نے مجھے بتایا کہ اس کے سوال پر کہ "تم نے وہاں باغیچہ میں کھڑی رہ کر اس کی گالیاں کیوں سنیں؟" ریشماں نے جواب دیا" اس وقت وہ اگر مجھے پیٹ ڈالتا، یا جان سے مار ڈالتا، تو بھی میں وہاں سے نہ ہلتی .....

پھر اس نے کہا، اے میری جان سہیلی، وہ گالیاں نہ تھیں، پھول تھے، میرے محبوب کے، جنھیں میں نے چن چن کر اپنے آنسوؤں کے تار میں پرو لیا، اور اپنے دل کے مزار پر چڑھا دیا، تاکہ محبت کی قبر سونی نہ رہے .....

لیکن ویکسی نیٹر نے غمناک آواز میں داستان ختم کرتے ہوئے کہا "مجھے اب کسی پر غصہ نہیں، کسی سے محبت نہیں۔ میں اب کسی کا لحاظ نہیں رکھتا، پہلے چیچک کے ٹیکے سفت لگاتا تھا، اب دو آنے لئے بغیر کسی کے بازو کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں اب اپنا روپیہ ڈیوڑھی فیس پر قرض دیتا ہوں، اس گاؤں میں سوائے ریشماں کے باپ کے سب میرے قرض دار ہیں۔ وہ مجھے کنجوس اور ظالم کہتے ہیں، لیکن انھوں نے کب میرا بھلا چاہا۔ ان کا بس چلے تو

مجھے آج قتل کر دیں، لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں، میرے پاس روپیہ ہے۔ زمین ہے۔ بال بچے ہیں۔ تین نکاح کر چکا ہوں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ کسی سے محبت نہیں۔ کسی پر غصہ نہیں، میں جاگیردار صاحب کی وفادار رعایا ہوں، اُن کا غلام ہوں"

"کیا سچ مچ تمھیں کسی پر غصہ نہیں آتا؟" رشید نے تیز نگاہوں سے ویکسی نیٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

ویکسی نیٹر گھبرا سا گیا، آنکھیں نیچی کر کے بولا" نہیں ہرگز نہیں میرا دل صاف ہے، لیکن دوست . . . . " اب ویکسی نیٹر نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھالیں اور رشید کی طرف محجوب نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا . . . . میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں اور اسے کہتے وقت میرا سینہ پھٹا جاتا ہے، اور میں یہ بات تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا، اور وہ بات جاگیردار صاحب کے اس پرانے محل کے برجوں کے متعلق ہے . . . . میں انھیں دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر بارہا پاگل ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں میرا منہ چڑا رہے ہیں۔ میں انھیں صاف صاف کہتے ہوئے سنتا ہوں، تم ہمیں نہیں جانتے، ہم اب بھی تمھاری دنیاؤں کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ تمھارے امن و سکون کو خس و خاشاک میں ملا سکتے ہیں

تمھاری زندگی کی خوشیوں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں۔ تم ہمیں نہیں پہچانتے۔ ہا ہا ہا!"

اور میں پاگل ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں، کہ جب تک یہ چکنے ہوئے برج موجود ہیں، میرے دل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ بار میرے دل میں خیال آتا ہے کہ ایک دو پیپے کا بارود لے کر میں رات کے وقت اس پرانے محل کے قریب جاؤں، اور بارود لگا کر بھک سے ان برجوں کو اڑا دوں تو..... تو..... لیکن میں نے ہر بار اس موذی خیال کو دل میں زور سے دبا دیا ہے"

اور ڈکیسی نیٹر نے رازدارانہ لہجہ میں رشید کی طرف جھک کر کہا

"لیکن ایک دن میں اس کام کو ضرور پورا کر کے چھوڑوں گا..

خونی ناچ

دوسرے دن عید تھی اور میں پانچ دن کی رخصت لے کر گھر جا رہا
تھا۔ ایک ٹرنک اور ایک گٹھڑی جس میں گوجرانوالے کے سرخ
اسٹے اور کچھ بچوں کے لئے کھلونے بندھے تھے۔ بس یہ مختصر سا سامان
تھا۔ جسے میں نے لاہور اترتے ہی کرایہ کے سالم تانگے پر لدوا لیا
ور خوشی خوشی گھر چلا۔ کل عید بھی تھی اور پھر خالہ اور خالہ کی لڑکی رفعت
ی آئی ہوگی۔ رفعت کی بڑی بڑی آنکھوں کی ملائمت اور اس کے
وب صورت لبوں کی مسکراہٹ بار بار گویا آنکھوں کے آگے آ کر کہہ رہی
ی۔ "اوہ بھائی جان، —— آپ بھی آ گئے — اب شودھنا کا خونی ناچ
یکھنے میں خوب لطف آئے گا۔" جب سے میں نے گوجرانوالہ میں شودھنا
ے رقص کے متعلق اخبار میں مضامین پڑھے تھے بس یہی سوچ رہا تھا کہ

عید ہو گی اور رفعت اور میں اور شو دھنا کا خونی ناچ۔ رفعت، رفعت، کتنا خوب صورت نام ہے اور مردانہ نام ہو تو عارف عتیق۔ محبوب، کچھ ہو، لیکن صابرہ، صابرہ ——— یہ نام تو ایسا ہے۔ جیسا کسی چمڑا بیچنے والے دکان دار کا۔ یکایک میونسپلٹی کی سڑک کے ایک گڑھے نے تانگے کو وہ ہچکولا دیا، کہ گھوڑا گرتے گرتے بچا، اور مجھے تو گویا دن میں تارے نظر آ گئے، اب تانگے والے کے منہ سے ایسی نئی "بطرزِ جدید" قسم کی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میں رشک و حیرت سے اس کے منہ کی طرف تکتا رہ گیا، میں نے سوچا کیا روانی ہے، زبان میں کس قدر لوچ ہے، کیسی مجھے دار تشبیہیں، کاش یہ تانگے والا ادیب ہوتا۔ شاہ عالمی سے لے کر لوہاری دروازے تک میونسپل باغ کے لکڑی کے بنگلے پر پرانے گرم کوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ اور ہر دس قدم کے فاصلے پہ دو تین کابلی پٹھان فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ اس وقت گرم کوٹ نہیں بیچ رہے تھے بلکہ تانگے والے کے منہ سے لاہور میونسپلٹی کے متعلق تعریفی کلمات اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ سیتلا کے مندر کے قریب تانگے والے کو ذرا رک جانا پڑا۔ یہاں بہت بھیڑ تھی۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ اور دو چار پولیس کے جوان بھی۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ شرط

بدکر بھاگنے والے دو تانگے آپس میں ٹکرا گئے تھے اور ایک مزدور جو بستر اٹھائے ہوئے آگے دوڑا جا رہا تھا ان دو تانگوں کے بیچ میں آکر بری طرح کچلا گیا تھا۔ اس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش سڑک پر پڑی تھی اور بستر کا مالک اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے تانگے والوں کی بدمعاشی کا، گاڑی سے لیٹ ہو جانے کا، اور بستر کے لہو سے ست پت ہو جانے کا بلند اور کرخت آواز میں ذکر کر رہا تھا لمبی لمبی مونچھوں کو سائیکل کے ہینڈل کی طرح موڑ کر رکھنے کا شوقین سپاہی ہنٹر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا "یہ سب ان تانگے والوں کی بدمعاشی ہے"

دوسرا سپاہی بولا "اپنا نام لکھاؤ لالہ جی"

مجمع میں مختلف آوازیں اٹھ رہی تھیں، "اوہو۔ اوہو، چ، چچ، چچ، مر گیا بے چارہ" "گھوڑے بھی زخمی ہو گئے ہیں" "کم بخت تانگے والوں کو کوئی چوٹ نہیں آئی!" "مگر دیکھئے اس تانگے والے کا تو کم سے کم سو روپیہ کا نقصان ہو گیا" "اف! ......"

تانگے اور موٹریں، لاریاں اور چھکڑے جمع ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے شاہ عالمی تک راستہ بند ہو گیا۔ آخر مشکل سے میرے تانگے والے نے بڑ کے درخت کے قریب "ہٹو مہربان۔ لالہ جی ایک طرف خاں صاحب، سنتری جی۔ سائیں جی، او مائی بچ جا" کہہ کر راستہ

نکالا، اور پھر گھوڑے کو جو چابک دکھایا تو لوہاری کے چوک میں پہنچ گیا۔خوانچے والوں کی صدائیں۔ انارکلی کے اندر گزرتے ہوئے تانگوں میں دلفریب ساڑیوں کی جھلک، "یہ لاہور ہے" اور سینما والوں کی اشتہاری گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاص پروگرام، ریجنٹ میں" نورِ اسلام" کراؤن میں" بانکی الفت" الفنسٹن میں" شاہی لٹیرا" راکسی میں شانِ قلندر" پربھات میں" شو دھنا کا ناچ"

شو دھنا کا ناچ اور رقعت!

بھاٹی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا "مجھے یہیں اترنا ہے" ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اٹھایا اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ تانگے والے نے چار آنے لے کر گھوڑے کا رُخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔ مزدور بولا" اسباب اٹھاؤں؟ جی؟"

"اٹھاؤ۔ ذیلدار روڈ پر لے چلو: یہاں سے قریب تو ہے۔ ایک آنہ دیں گے"

کچھ جواب دئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے بستر اور گٹھڑی اٹھالی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔میں نے یونہی پوچھا۔ ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو؟"

"جی نہیں، نیا نیا آیا ہوں" اس کا لہجہ نہایت خوش گوار اور دیہاتی تھا، شہری تصنع سے بالکل پاک،

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ملتان سے"

"خاص ملتان سے؟"

"جی نہیں، ملتان کے پاس پارووال گاؤں ہے، وہاں سے آیا ہوں، پہلے لائل پور گیا تھا، پھر ادھر لاہور آ گیا ہوں"

"کیا لائل پور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی؟"

"مزدوری تو ——— ملتی تھی، مگر..... بات یہ ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی..... ہم چار بھائی ہیں، میرے تین بڑے بھائی بیاہے ہوئے ہیں۔ مگر میں کنوارا ہوں۔ دو بڑے بھائی تو پارووال میں کاشت کرتے ہیں۔ زمین تھوڑی ہے۔ گزارہ نہیں ہوتا۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری کے لئے ملتان سے لائل پور منڈی آئے تھے اور ایک دن جب ہم گھنٹہ گھر کے قریب سستا رہے تھے۔ ہمیں ایک بابو ملا۔ اس نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی۔ ہم سے پوچھنے لگا "مزدوری کروگے۔؟" ہم نے کہا "کریں گے" بولا یہاں کیا

لیتے ہو؟" ہم نے کہا "آٹھ آنے روزانہ" کہنے لگا "میں بارہ آنے روزانہ دوں گا۔ لیکن تمھیں ملکوال میرے ساتھ چلنا پڑے گا" ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملکوال چلے گئے۔ وہاں سے وہ ہمیں سدھووال لے گیا، راستے میں ہمیں تسلی دیتا گیا کہ بڑا آسان کام ہے، بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا، ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی۔ لیکن سوچا، اس میں کیا ہے، کریں گے۔ سدھووال جا کر اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال تھما دی اور ریلوے لائن پر لے گیا، اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ زمین کھودنی ہے۔ اور جتنے فٹ زمین روز نکلوا دو گے اس کے حساب سے تمھیں پیسے ملیں گے، اس حساب سے ہمیں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے، اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ اور بازو شل ہو گئے۔ ایسی سخت مٹی تھی وہ، آخر ایک دن رات کو ہم دونوں بھائی بھاگ نکلے، اس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا، اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا۔ پھر ہم یہاں آ گئے، یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں۔ وہاں بارہ بجے تک چار آنے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم دن بھر ادھر اُدھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں۔ بہت ہوا تو کسی دن آٹھ نو آنے بن گئے۔ لیکن عام

طور پہ پانچ چھ آنے سے زیادہ روزانہ کمائی نہیں ہوتی۔"

میں نے پوچھا "تم رات کو رہتے کہاں ہو؟"

"جی داتا کے دربار میں"

"وہاں جگہ ہے؟"

"مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے، اور پھر ہم انھیں خوش بھی کر دیتے ہیں"

"اچھا؟"

"جی"

اب میرا گھر سامنے آگیا تھا، ننھا عبید سامنے مٹی میں کھیل رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور دیکھتے ہی اپنی توتلی زبان میں چلا اٹھا "بھائی جان آ گئے" اور یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔

دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گٹھڑی فرش پہ رکھ دی اور ایک طرف کھڑا پسینہ پونچھنے لگا، اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے، اور پیار بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ننھا عبید اور منجھلا بھائی، اماں، اور رفعت، رفعت کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔

منجھلے بھائی بولے "ہم تو صبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے، اماں بولیں "رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا؟"

رفعت نے ہنستے ہنستے کہا "بھائی جان ہم تو آج ہی مشہد دھنا کا ناچ

دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں!"

مزدور کونے میں سے بولا "مجھے پیسے جلد دیجیے، میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کے ساتھ بستر اٹھا کر گیا ہے، اور اب واپس آکر داتا جی کے دربار میں انتظار کر رہا ہوگا" پھر مسکرا کر کہنے لگا "کچھ انعام بھی مل جائے، کل عید ہے بابو جی!"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر یکایک میرا ہاتھ رک گیا۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا، میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے رفعت کی مسکراہٹ پھیلتی ہوئی ساری فضا میں عجیب حلقے بناتی ہوئی دکھائی دی شو دمنا کے رقصاں پاؤں میں بندھے گھنگرو زور زور سے چھنکنے لگے، ساری کائنات لرز رہی تھی، انارکلی میں گزرتے ہوئے تانگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے فضا میں لڑھکنے لگے۔ اب چاروں طرف خون ہی خون تھا، اور دو پتھرائی ہوئی آنکھیں اس میں سے باہر جھانک رہی تھیں، اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے بھنبھنانے کی گونج کے ساتھ کہہ رہا تھا "اسے ہے، سچ سچ تو بے چارہ مر گیا ...."

دل کا چراغ

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، تو چار بجے تھے اور خواب گاہ
کھڑکی کے سامنے سڑک کے اس پار سکھ دکاندار کی دکان سے
سکھ منی جی کے پاٹھ کی آواز آ رہی تھی۔ لہجے سے صدق، عجز اور
پاکیزگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن آواز ذرا اونچی ہوئی تھی، اس
لئے برابر چلی آ رہی تھی، ایسی آواز جو اپنی پاکیزگی کے باوجود میرے
کانوں کو تیز معلوم ہوئی۔ گویا کہہ رہی تھی مردود تجھے اپنے خالق کا
کچھ پاس نہیں کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے، شرم نہیں آتی تجھے، دیکھ
تارے ماند پڑ رہے ہیں۔ مشرق سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اور میں
بیچنے قادر مطلق کی تعریف کا گیت بن کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں
اٹھ، اٹھ، بے شرم، کافر، ملحد، دہریئے، آواز اونچی ہو رہی تھی

ٹکراتی ہوئی لرزتی ہوئی۔ گویا اپنے آپ کو ربِّ عظیم کے آستانے پر نچھاور کرتی ہوئی میری کھڑکی کے اندر چلی آرہی تھی۔ میں نے نیند سے بھرے ہوئے پپوٹوں کو اٹھائے بغیر ہی کھڑکی کے پردے گرا دیئے۔ کھڑکی بند کر دی، اور لحاف منہ اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر سو گیا۔ لیکن میرے اللہ وہ آواز ابھی تک آرہی تھی۔ اور اب تو گویا چلا چلا کر کہہ رہی تھی، اُٹھ، اُٹھ،

"اُٹھ فریدا سُتیا تے من دا دیوا بال" (اے سوئے ہوئے فرید، اُٹھ، اور دل کا چراغ روشن کر دے)

گو میرا نام فرید نہیں، لیکن پھر بھی میں نے اب یہی مناسب سمجھا کہ بستر پہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں اور میز پر پڑے ہوئے ٹیبل لیمپ کو روشن کر دوں۔ جب کمرے میں اجالا ہو گیا تو روشنی اور آواز دونوں نے مل کر نیند کا میٹھا تسکین دہ خمار میری آنکھوں سے بالکل دور کر دیا اب مجھے آنکھوں میں ایک جلن اور چبھن سی محسوس ہو رہی تھی اور اب معلوم ہوا کہ یہ آواز نہ تھی بلکہ سوئیاں اور کانٹے تھے جو میری آنکھوں میں چبھ رہے تھے میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول دی ایک زناٹے دار آواز آئی۔

"اُٹھ فریدا سُتیا تے من دا دیوا بال

صاحب جنھاں دے جاگدے نفراں کی سونے نال"
اور جب تیرا صاحب جاگ رہا ہو تو اے بہرے کے بچے تجھے سونے کا کیا حق ہے!)

بالکل درست، پیر و مرشد، بالکل درست، آج کی خطا معاف ہو، کل اگر چار بجے سے پہلے ہی نہ اٹھوں تو پھر ——— بھلا آپ کی آواز ہی مجھے کیوں چین لینے دے گی،

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، تو سامنے سکھ دکان دار کی دکان پر کوئی جھاڑو دے رہا تھا۔ ٹین کے ڈبوں کو جھاڑ کر اپنی جگہ رکھ رہا تھا۔ آٹے اور دال کی بوریوں کو اٹھا اٹھا کر قرینے سے سجا رہا تھا، یہ وہ بے چارہ کوتاہ قد زرد رو سکھ دکان دار تو نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ شمع کی ہلکی سی لَو میں اس کی لمبی پرچھائیں، اس کا چست پائجامہ، اور کاندھوں کے گرد لپٹا ہوا کھیس نظر آ رہا تھا یا پھر وہی صدائے برحق۔

گن گاویں تے من بھاویں (اپنے گورو کی تعریف کر، تاکہ تو اس کے دل میں گھر کر سکے)

جی!
گن گاویں تے من بھاویں

جی !

جی ! بالکل درست، پیر و مرشد، بالکل درست، اگر میں اپنے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی دن رات خوشامد نہ کرتا تو آج محض ایک "ایف۔ اے فیل" ہو کر پچھتّر روپے تنخواہ نہ پاتا۔

"جی، ست سری اکال!" اب وہ لمبی پرچھائیں دکان کے باہر آ گئی تھی۔ جس نعرے نے گورو نانک نگر کے در و دیوار ہلا دیئے تھے ؛ وہ نعرہ میری کھڑکی کھلی دیکھ کر ہی لگایا گیا تھا۔

"آہا، بابو جی، آج تو آپ "بڑے سویرے" اٹھ بیٹھے۔ لمبی پرچھائیں نے کہا۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بابو جی، سویرے اٹھنا بہت اچھا ہوتا ہے۔ اب تو خیر بہت اجالا ہو گیا ہے۔"

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، گھٹا ٹوپ اندھیرا، ابھی تو چار ہی بجے تھے، ستارے چمک رہے تھے، اور بجلی کے کھمبوں پر قمقمے بھی۔ اجالا کہاں ہے، میں نے سوچا، پھر خیال آیا کہ یہ معرفت کی باتیں ہیں، تو بے وقوف انھیں کیا جانے۔ جس کے دل میں اجالا ہوتا ہے۔ اسے ہر طرف اجالا ہی اجالا دکھائی

دیتا ہے۔

میں نے پوچھا، یہ ـــــ دکان کے ـــــ نند سنگھ جی کہاں ہیں؟

گھر پر ہی ہیں جی، وہ تو ابھی سو رہے ہوں گے جی، میں نے سوچا چلو، ان کے گھر مہمان بن کر آیا ہوں تو کچھ سیوا ہی کروں، کر سیوا۔ کھا میوہ، میرا نام درشن سنگھ ہے جی، میں نند سنگھ جی کے بڑے سالے کا بڑا لڑکا ہوں، جی، میں نورپور میں گرنتھی ہوں، نند سنگھ جی ذرا بیمار رہتے ہیں، انھیں مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہو گا۔ واہگورو مہاراج سب کا بھلا کرے، تو ـــــ انھوں نے مجھے یہاں بلا لیا ہے ذرا دکان کے کام کاج میں مدد ہو جاتی ہے۔ میں یہیں دکان پر سویا کروں گا۔ واہگورو، واہگورو، اب تو دن چڑھ گیا ہے! او بنیئے او بنیئے، اُٹھ دکان کھول۔ کیا دیکھتا ہے۔ دن کبھی کا نکل آیا ہے۔

درشن سنگھ بنیئے کو آوازیں دینے لگا، بے چارہ بنیا اس دکان کی نچلی منزل میں جہاں میں رہتا ہوں۔ آٹا۔ نون۔ تیل سبزی سودا واٹر اور پکوڑے بیچتا ہے۔ اس کی بیوی کا رنگ

ذرا کھلتا ہوا سا ہے اور وہ ہمیشہ مینا کی طرح چہکا کرتی ہے دکان پہ کام کرتی ہے۔ گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی ہے۔ نگر کے کنوارے لڑکے، بدصورت بیویوں کے ادھیڑ خاوند، پوربیے دھوبی۔ نائی۔ موچی اور اکھاڑے میں کشتی لڑنے والے پہلوان سبھی بنیئے کی دکان سے سودا لیتے ہیں۔ کرسی پہ بیٹھ کر پکوڑے کھاتے ہیں، بڑی رغبت سے، یا بنیئے کی بیوی سے "سوڈا واٹر کی ایک بوتل کھول دینا" اور "آج تو بنیائن خوب بنی ٹھنی ہو" "ہی ہی ہی ہی ....."

اور بنیئے کی بیوی بوتل سے کاگ اڑاتے ہوئے کہتی ہے "ہٹ مردود"

دوسرے دن درشن سنگھ کے پہلے مصرعے نے ہی مجھے جگا دیا، گھڑی کی طرف دیکھا تو کم بخت پورے چار بجے تھے، میں نے سوچا یہ آدمی ہے یا گھڑیال، میں نے لحاف میں منہ چھپا کر اپنی بدبختی پر رونے کی کوشش کی، لیکن جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو کیسے آتے، میں نے درشن سنگھ کو، اس کے آباؤ اجداد کو، اپنی قسمت کو، فرید بابا کو لاکھ لاکھ کوسنے دیئے۔ اتنے میں میں نے سنا

کہ نچلی منزل سے بھی ایک ہلکی ہلکی صدا اٹھ رہی ہے۔

اوم، جے جگدیش ہرے

جے جگدیش ہرے اے اے .....

بنیا اپنی پھٹے ہوئے ڈھول کی سی آواز میں گا رہا تھا وہی صدق۔ عجز اور پاکیزگی، لیکن کچھ خاص قسم کی تیزی۔ جو گو یا درشن سنگھ سے کہہ رہی تھی، تم ہمیں کیا سمجھتے ہو، ہم تم سے پیٹے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اپنا بھگوان کچھ کم پیارا نہیں۔

اونہہ!

اور اب بنیا اور اس کی بیوی اور دونوں بچے اپنی ملی جلی آوازوں کے ساتھ کہہ رہے تھے

بھگت جنن کے سنکٹ چھین میں دور کرے (وہ اپنے بھگتوں کے دُکھ ایک پل میں دور کر دیتا ہے)

اوم

جے جگدیش ہرے اے اے

اور بنیے کی بیوی کوئل کی طرح کوک کوک کر کہہ رہی تھی،

تم بن اور نہ دُوجا

تم بن اور نہ دُوجا

آس کروں جس کی
اوم جے جگدیش ہرے ہرے۔

ایک درمیانی وقفے میں درشن سنگھ نے خوش ہو کر بنئے سے اونچی آواز میں کہا۔ "بنیا جی، آہا واہگورو کا نام لینے میں کتنا آنند ہے؟ بنئے نے پُرخلوص لہجے میں کہا، آہا، رام کی مہما ——— اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

درشن سنگھ کے آتے ہی نگر میں دھرم کرم کے چرچے ہونے لگے، یہ نگر لاہور ہی کی آبادی کا ایک حصہ ہے یہاں اس لئے کوئی خاص مذہبی مجلسیں قائم نہ ہوئی تھیں سلے دے کر ایک سنگھ سبھا تھی۔ جس کا اجلاس سال میں شاید ایک مرتبہ ہی ہوتا تھا، جس مکان میں میں رہتا تھا، اس سے بس دس پندرہ قدم آگے جا کر مغرب کی طرف ایک مسلمان قلعی گر، ایک مسلمان رنگساز ایک مسلمان حکیم اور ایک مسلمان سائیکل کے مستری اور ایک مسلمان سبزی فروش کی دکانیں تھیں۔ ان سے آگے کھلی جگہ تھی جہاں اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ یہاں سکھ۔ مسلمان۔ ہندو اور چمار پہلوان سب اکٹھے ہو کر کشتی لڑا کرتے تھے۔

لیکن درشن سنگھ کے آتے ہی لوگوں میں گویا صدق و ایمان کی روح پھونکی گئی۔ ست سری اکال اور اوم جے جگدیش ہرے کے بعد مسلمان رنگ ساز نے یہ مناسب سمجھا کہ نور ایمان مردہ دلوں میں تازہ کیا جائے، چنانچہ اب کچھ دنوں سے اس کی دکان پہ ایک سبز منکوں والے اور سبز چغے والے پیر جو بیک وقت پیر اور مولوی اور عامل تھے تشریف لانے لگے، اب رنگ ساز کی دکان پر ہمیشہ ایک جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، اور سائیکلوں کے مستری کے نوجوان کے لڑکے یا علی، یا علی کرتے اور خوشی سے ناچتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ مسلمان سبزی والے کا متبا کو کا خرچ بڑھ گیا تھا، اور حکیم صاحب ایک دن اپنے چھوٹے لڑکے کو بنئے کی دکان پہ پکوڑیاں کھاتے ——— دیکھ کر غصے میں آکر پیٹنے لگے۔

پھر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بولے "یہ کم بخت ہمیشہ گندی چیزیں کھاتا ہے۔ میں نے اسے سو بار سمجھایا ہے"

چند روز کے بعد جب میں ایک شام کو دفتر سے تھکا ماندہ واپس آرہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لکڑ کا بازار جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے، اور بازاروں میں سنگھ سبھا کے والنٹیر ٹولیاں

بنائے، جگہہ جگہہ کھڑے ہیں۔ جن میں سے کئی ایک نے گلے میں ہار پہن رکھے ہیں۔ اکثر لوگ پان چبا رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ ننھے ننھے سکھ لڑکے بھی کرپانیں پہنے ہوئے ہیں، اور اُبلے ہوئے چنے کھا رہے ہیں۔ یا کھٹے کچالو۔ یا پلیٹوں میں جمی ہوئی سُرخ سُرخ چینی گھاس کی کھیر۔

درشن سنگھ نے مجھے دیکھتے ہی ست سری اکال کا جےکارہ لگایا۔ "آہا، بابو جی، آج بابا جی رہا ہو گئے۔"

"کون سے بابا جی؟"

"واہ ——— آپ کو بھی پتہ نہیں، آپ تو روز اخبار پڑھتے ہیں، وہی واہگورو جی کے سچے خالصہ بابا ٹیک سنگھ جی۔"

بنیئے کی دکان پر کھڑے ہوئے ایک والنٹیر نے کہا۔ زندہ شہید، بابا ٹیک سنگھ جی رہا ہو گئے ہیں، آج ہم ان کو ایڈریس دیں گے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے" میں نے کہا۔

ساتھ والے مسلمان قلعی ساز کی دکان پر شہید گنج کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور "گرما گرم" بحث ہو رہی تھی۔

دوسرے دن میری نیند روز کی طرح اچاٹ ہو گئی۔ لیکن

باقی آوازوں کے ساتھ ہی ایک ریکارڈ بھی بج رہا تھا۔ مکان کے دوسرے حصے میں میری طرح ایک اور کرائے دار رہتا تھا' میری ہی طرح ایک دفتر میں ملازم تھا اور اب وہی منہ اندھیرے اٹھ کر ریکارڈ بجا رہا تھا۔

نو بجے کے قریب وہ مجھے سیڑھیوں پر ملا۔ میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا: "آج تو آپ صبح ہی اٹھ بیٹھے"

"ہو ہو ہو" بابو جی نے ہنستے ہوئے کہا "ہا ہا ہا۔ مجھے مہاتما جی کا ریکارڈ بہت پسند ہے، آپ کو پتہ ہے۔ مہاتما جی کو یہ گیت خاص طور پر پسند ہے"

کونسا گیت؟

"یہی جس کا میں صبح ——— ریکارڈ بجا رہا تھا، اٹھ جاگ مسافر بھور بھئی" کیسا میٹھا گیت ہے، اسے صبح سن کر طبیعت بشاش ہو جاتی ہے"

اور پھر وہ یہ گنگناتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

"اٹھ جاگ، اٹھ جاگ، مسافر بھور بھئی، اب رین کہاں' جو سووت ہے۔ اے۔ اے"

پرسوں ایک حادثہ ہو گیا تھا، گوشت سے بھرے چھکڑے تانگے بوچڑ خانے سے آتے ہوئے اسی طرف سے گزرتے ہیں میونسپلٹی کی سڑک پر بہت سے گڑھے پڑ جانے کی وجہ سے اکثر چھکڑوں کے بیل یا تانگوں کے گھوڑے چوٹ کھا کر گر پڑتے ہیں۔ اور کئی بار گوشت زمین پر گر جاتا ہے۔ چنانچہ پرسوں بھی ایک تانگہ سکھ دکان دار کی دکان کے سامنے الٹ گیا، اور گوشت دکان کے قریب زمین پر گر پڑا۔ تانگے والے کو بہت سی چوٹیں لگیں۔ چنانچہ پرسوں شام ہی کو "پریم سبھا" کے سکرٹری میرے پاس آئے اور بولے، "اس کا تدارک ہونا چاہئے"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میونسپلٹی کو لکھ دیجئے"

بولے "نہیں آپ میری بات نہیں سمجھے۔ یہ راستہ ہی بوچڑ کے لئے بند ہو جانا چاہئے۔ یہ ہندو سکھ آبادی ہے، ہماری توہین ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ دیکھئے نا، یہاں چھوٹے بچے، لڑکے بالے گھومتے رہتے ہیں اگر کسی کے چوٹ لگ جائے، اگر کوئی مر جائے تو ——"

میں نے کہا یہ تو درست ہے۔ مگر بوچڑ خانے کا بھی تو یہی

راستہ ہے۔ اور ــــــــ"

پریم سبھا کے سیکریٹری بولے "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ہمیں اخبار میں خبر بھیجنے کے لئے ایک مسودّہ بنا دیجئے۔"

میں نے کہا۔ "یہ پریم سبھا کب بنی ہے؟"

وہ بولے: "تین چار دن ہوئے، یہاں چار پانچ ہندوؤں نے مل کر بنائی ہے، آپس میں مل بیٹھنا اچھا ہوتا ہے۔"

پنڈت سدھ دیو کے دو لیکچر بھی ہو چکے ہیں۔ سبھی لوگ آئے ہوئے تھے، آپ کہاں رہے؟"

"میں؟" ــــــ میں نے کہا۔ "کس مضمون پہ لیکچر ہوئے تھے؟"

"جاپان میں ویدک دھرم!" نہایت اعلیٰ لیکچر تھا۔ پنڈت جی نے ثابت کر دیا کہ ساری دنیا ویدک دھرم قبول کرنے کو تیار ہے، مگر ہم لوگ بہت سست ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ساری دنیا میں اپنے پرچارک بھیجنے چاہئیں، انھوں نے بتایا کہ ......"

میں نے کہا۔ "میں کل آپ کو مسودّہ تیار کر دوں گا۔"

دوسرے دن صبح ہی یہاں ایک فساد ہو گیا' ہندو مسلم سکھ فساد، خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری نو آبادی میں ہراس

پھیل گیا، اِکّے دُکّے پر کرپانوں اور چھُریوں سے حملے ہونے لگے، سکھوں کی کرپانوں نے، بوچڑوں کی بچھریوں نے اور پوربیوں کی لاٹھیوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ صبح سے لے کر دوپہر تک نعرے بلند ہوتے رہے۔

پریم سبھا کے سیکرٹری نے شام ہی کو للکار کر کہہ دیا تھا۔ کہ بوچڑوں کو اس بازار میں سے گزرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بوچڑوں نے سربازار کہہ دیا تھا کہ وہ صبح اسی سڑک پر سے گزریں گے اور ضرور گزریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ کون مائی کا لال انھیں روکتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی بوچڑ اپنے چھکڑوں اور تانگوں پر گوشت لادے ہوئے گزرنے لگے۔ سبھی خاموش تھے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انھیں روکتا۔ کہ اتنے میں درشن سنگھ نے للکارا "ٹھہر جاؤ" اور کرپان لے کر میدان میں آ گیا۔

مسلمان رنگ ساز نے کہا "اللہ۔ ہو۔ اکبر"

بنیا جلد جلد اپنی دکان بند کرنے لگا، وہ اسی دکان میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے بھی نچلی منزل کا بڑا دروازہ بند کرا دیا، اور پھر تماشا دیکھنے کے لئے کھڑکی میں

آ بیٹھا، لیکن ذرا ہٹ کر، تاکہ کہیں کوئی اینٹ میرے ہی نہ آ لگے۔

پریم سبھا کے حمایتی پوربیوں نے ہلہ کر کے مسلمان حکیم اور رنگ ساز اور سائیکل اور سبزی والے کی دکانیں لوٹ لیں سکھ اور پوچرٹ لڑ رہے تھے، اتنے میں گھاٹی دروازے سے کمک پہنچ گئی اور مہنت نگر سے بپھرے ہوئے ہندو بھی، میں نے مصلحتاً کھڑکی بند کر دی۔ میری کھڑکی پر اینٹیں پھینکی جا رہی تھیں، بنئے کی دکان توڑی جا رہی تھی۔

چیخیں، دردناک، ہیبت ناک چیخیں، نعرے۔ فلک شگاف نعرے، لاٹھیوں کے چلنے کی آوازیں۔

دکانوں کے دروازے ٹوٹنے کی آوازیں۔

دو تین گھنٹوں کے بعد یک لخت چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اب فساد مہنت نگر سے آگے بڑھ کر دوسرے محلوں نو آبادیوں اور شہر کی گلیوں کوچوں میں پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا، دور دور نعروں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، لیکن یہاں ——— موت کی سی خاموشی تھی

میں نے چند منٹ کے سکوت کے بعد آہستہ سے کھڑکی کا پٹ

کھول کر دیکھا۔

دکانیں لٹی پڑی تھیں، اشیا بازار میں بکھری ہوئی تھیں چند بوچڑ اور سکھ مرے پڑے تھے۔ کئی زخمی پڑے کراہ رہے تھے۔ جن میں میرا پڑوسی بنیا بھی تھا اور اس کی بیوی بھی، جو اسے بچانے کی کوشش میں بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ وہ میری کھڑکی کے نیچے پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر اس کی وہ تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ جب میں نے اسے ایک دن پچھلی منزل میں راکھی کے روز دیکھا تھا۔ میں دالان میں کھڑا سائیکل صاف کر رہا تھا کہ وہ بے تحاشا بھاگتی ہوئی آ کھڑی ہوئی۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ، رنگین کنارے والی دھوتی اور سڈول بازو مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ ساری دنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہو گئی ہے۔ اور پھر دوسرے لمحے ہی میں وہ میرے سامنے سے غائب ہو گئی تھی، لیکن اس کی وہ حسین تصویر، وہ رنگین پرچھائیں ایک عرصہ تک میرے آئینۂ دل پر لرزتی رہی تھی،

اور اب؟

جب میں نے پھر کھڑکی بند کی تو سائیکلوں کا بوڑھا
ستری اپنے نوجوان لڑکے کی لاش کو اپنے کاندھوں پر
ٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

فساد کو ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ اب یہاں امن امان ہے
نّو اور ماتا دین کو پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ بنیا اپنے بال
بچّوں کو لے کر رہتک چلا گیا ہے، بوڑھا مستری جس کے
دونوں بچّے فساد میں ہلاک ہو گئے تھے اب گردن جھکائے سائیکل
درست کرتا ہوا نظر آتا ہے، درشن سنگھ کا کوئی پتہ نہیں نند سنگھ
نے مجھے ایک دن آہستہ سے بتایا کہ وہ آج کل شکارپور میں
گرنتھی ہے، اور اب اس نے اپنا نام سکھ چین سنگھ رکھا ہوا
ہے۔ مسلمان رنگریز نے کہا کہ سبز جوتے والا مولوی آجکل جلالپور
کی مسجد میں امام ہے۔ اب آہستہ آہستہ لوگ ایک دوسرے
سے اچھی طرح ملنے جلنے لگے ہیں، پریم سبھا کا سکرٹری، اب
ادھا نگر میں رہتا ہے۔ بوچڑ لوگ گوشت کو ڈھانپے ہوئے
سی طرح سڑک پر سے گزرتے ہیں۔ سڑک پر میونسپلیٹی کے
گڑھے اسی طرح موجود ہیں لیکن تعزیری پولیس ضرور تعینات

کر دی گئی ہے۔

اب مجھے صبح چار بجے کوئی نہیں جگاتا۔ بابو جی، جو دوسرے حصے میں ہیں اب ریکارڈ نہیں بجاتے۔ کیونکہ وہ فساد میں ٹوٹ گئے تھے۔ اب کوئی "دل کا چراغ" روشن کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اب بالکل امن ہے لیکن میں پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر روز شکارپور اور جلال پور کی خبریں پڑھ لیا کرتا ہوں!!!

تلاش

وہ مصور تھا، اسے حُسنِ معصوم کی تلاش تھی، اس کی تلاش میں وہ سرسبز وادیوں اور بے آب وگیاہ میدانوں میں گھومتا رہا، اس نے بڑے بڑے شہروں، چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دور دور کے اِکّے دُکّے گاؤں میں اس کی تلاش کی، لیکن اسے نہ پاسکا۔ ایک دفعہ ایک کھیت کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک گلاب کے حسین پھول کو دیکھا کہ باڑ سے باہر جھکی ہوئی شاخ پہ بیٹھا ہوا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا، لیکن پیشتر اس کے کہ مصوّر اس کی ایک پتی کا ہلکا سا نقش ہی اتار سکتا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور گلاب کی نازک پتیاں اٹھلاتی ہوئی ہوا کے دوش پر بکھر گئیں۔

ایک دفعہ جھیل کی نیلی خاموش سطح پہ اس نے کنول کے

نوزائیدہ پھول کو دیکھا، کہ سر جھکائے پانی میں اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ خوب صورت، نازک، زرد اور سپید اور برف کی طرح پاک و صاف، مصور نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنا رنگوں والا ڈبہ کھولا۔ یکایک، جھیل کی خاموش سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھیں اور کنول کے پھول کی طرف بڑھتی گئیں۔ انھوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور پھر موت کے دلکش راگ گاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

کبھی کبھی "ڑوں ڑوں" کرتے ہوئے کنوئیں کے قریب سے گزرتے ہوئے مصور کو گمان ہوتا، کہ اس نے پانی بھرتی ہوئی حسینہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ آہستہ سے اپنی متجسس نگاہیں حسینہ کے چہرے کی طرف پھیر دیتا اور عین اس وقت کہ جب پیتل کی گاگر میں پانی رقص کرتا ہوا باہر اچھل پڑتا حسینہ مصور کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑتی۔ ایسی مسکراہٹ جو گویا مصور سے کہہ رہی تھی "میں تجھے صدیوں سے جانتی پہچانتی ہوں" اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے شہر میں چلتے چلتے مصور نے سڑک کے کنارے ایک خوبصورت بچے کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور ٹھٹھک گیا اور اس نے بچے کو پیار سے بلایا۔

شریر ننھے نے مصور کی طرف ایک چھوٹا سا پتھر کھینچ مارا اور پھر اپنی جسارت پر خود ہی ہنسنے لگا۔

مصور کا دل پریشان ہوگیا، لیکن اس نے اپنی تلاش کو جاری رکھا۔

وہ ایک صحرائی ہرنی کی طرح وحشی تھی اور آسمان پر اڑتی ہوئی بابیل کی طرح نغمہ ریز، وہ ہر روز جنگل میں اپنا ریوڑ چرانے جاتی تھی، وہاں وہ ایک چٹان پر جو سبز سبز کائی سے ڈھکی ہوئی تھی بیٹھ جاتی ..... گہرے سیاہ اور ریشم کی تاروں کی طرح نرم و نازک بال اپنے شانوں پر بکھیر دیتی اور بھیڑ بکریوں کے ننھے ننھے بچوں سے کھیلتی رہتی جنگل کے گھنے سایوں میں کہیں کہیں سورج کی کرنیں جھلملاتی رہتی تھیں اور کہیں کہیں دھوپ کے بڑے بڑے حلقوں میں چیڑ کے نکیلے جھومر کسی نامعلوم مسرت کے زیر اثر تھرتھراتے رہتے تھے، کبھی مشرقی ہواؤں کے لطیف جھونکے انہی جھومروں میں بیٹھ کر دلکش گیت سناتے تھے اور پھر یکایک گیت سناتے سناتے تھم جاتے، کیونکہ اب وہ چٹان پہ بیٹھی ہوئی گا رہی تھی، وہ مسرت زا ننھے بھیڑ بکریوں کے ننھے بچوں کے لئے میٹھی میٹھی

لوریاں تھے، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ گیت سنتے سنتے ہوا تھم جاتی پھول غنودگی میں آکر اونگھ اونگھ جاتے اور سارا جنگل کسی نامعلوم سکینے میں کھو جاتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت مصور کا گزر اس جنگل سے ہوا۔ وہ چٹان پر بیٹھی تھی اور اپنی گود میں ایک بھیڑ کے بچے کو لئے ہوئے اس سے کھیل رہی تھی، وہ کبھی اُسے دور اوپر ہوا میں پھینک دیتی اور پھر باہیں پھیلا کر ممیاتے ہوئے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیتی اور اسے زور سے اپنی چھاتی سے لگا لیتی اور کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

مصور نے لڑکی کو دیکھا اور ٹھہر گیا، اور بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا "ادھر ——— میرے قریب آکر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لئے ایک نہایت خوب صورت تصویر بناؤنگا"

وحشی لڑکی نے حیران نگاہوں سے مصور کی طرف دیکھا، پھر اس نے ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ سر کو جھٹک دیا اور مصور کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

دن گزرتے گئے مصور بہت خوش تھا۔ تصویر آدھی سے

زیادہ مکمل ہو چکی تھی، چند دنوں میں وہ اسے مکمل کرلے گا، اور پھر تصویری دنیا میں اس لافانی شاہکار کو پیش کرکے شہرت دوام حاصل کرلے گا۔

اور گاؤں میں لڑکی ناچ ناچ کر اپنی ہمجولیوں سے کہتی "وہ میرے لئے ایک تصویر بنا رہا ہے۔ ایک نہایت اچھی، خوبصورت تصویر، آہا ہا، کتنی اچھی تصویر ہوگی" اور پھر وہ باہیں پھیلا کر اپنے ناچتے ہوئے قدموں پر گھوم گھوم جاتی آہا ہا۔ آہا ہا۔ اس پر گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتیں ایک مضمحل انداز میں مسکرادیتیں اور نوجوان چرواہے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپ ہو رہتے۔

ایک دن جب وہ صبح کے وقت ریوڑ کو کھلے سے باہر نکال رہی تھی، ایک نوجوان چرواہے نے اس سے پوچھا "کیا تمھیں پتہ ہے لیلےٰ کہ وہ تمھاری ہی تصویر بنا رہا ہے؟ کیا تمھیں پتہ نہیں؟ نہیں تو ——— لیکن اگر تم چاہو تو میں اس سے پوچھ سکتی ہوں۔

لیکن چرواہے نے پھر سوال کیا "اور کیا تمھیں یہ پتہ بھی نہیں

کہ وہ تمھاری تصویر کیوں بنا رہا ہے؟"

نہیں .... لیکن اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تصویر بنا کر مجھے دے دیگا ...... کیوں ...... کیا بات ہے؟"

نوجوان چرواہا ہنستے ہنستے جھک ہو گیا۔ آہ ...... اوہ ...... اوہ ...... تمھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ تمھاری ہی تصویر ہے ...... اوہ ...... بے وقوف معصوم لڑکی ...... اوہو ...... اوہو ہو تم کس قدر بھولی بھالی ہو۔ اور تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ تمھاری تصویر کیوں بنا رہا ہے؟ کیوں؟ ارے ہو ہو!

لڑکی پریشان ہو گئی اور آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہ کسی دوسرے آدمی کو ہنستے دیکھ کر خود نہ ہنسی۔ پھر ریوڑ کو لے کر وہ آہستہ آہستہ جنگل کی طرف چلی گئی۔

مصور نے اس کی طرف دیکھ کر ٹرک ٹرک کر کہا "تم آج دیر سے آئی ہو۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ بھی رہی ہو۔

ہاں، مجھے آج دیر ہی ہو گئی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مصور کی موجودگی میں ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتی تھی۔ راستے میں مجھے حسن ملا تھا، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ تمھاری ہی تصویر بنا رہا ہے، میں نے جواب دیا مجھے پتہ نہیں۔ کیا یہ میری تصویر ہے؟ کیا میں

اس تصویر میں ہوں ؟

ہاں ، لیکن تم ایسا کیوں پوچھتی ہو ؟

اوہ ——— یونہی ——— لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم میری تصویر کیوں بنا رہے ہو؟

مصور بے چین ہو گیا، اس نے لیلےٰ کی طرف دیکھا اور پھر چپ ہو رہا اس نے محسوس کیا کہ آج اس کے ہاتھ تصویر پر جمتے ہی نہ تھے !

شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں گاؤں جاتے ہوئے راستے میں اسے حسن مل گیا۔

"کیا تم نے اس سے پوچھا تھا ؟"

"ہاں . . . . . اس نے کہا وہ میری ہی تصویر ہے"

"لیکن . . . کیوں ؟"

"اس نے اور کچھ نہیں کہا"

آہ، میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں ؛ حسن نے لیلےٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا" اسے تم سے محبت ہے، لیلےٰ! اسے تم سے محبت ہے ۔ تم بہت حسین ہو لیلےٰ، کیا تم نہیں جانتی ہو کہ تم کس قدر حسین ہو؟ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے ۔ میری معصوم لیلےٰ، محبت، کیا تمھیں پتہ نہیں کہ محبت کسے کہتے ہیں ؟"

جیسے لیلا کی روح کا ذرہ ذرہ صدیوں کی نیند سے جاگ اٹھا۔ کوئی اس کے دل کے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا، اٹھ بھکارن دروازہ کھول دے کہ یہ معبد میرے بغیر سونا پڑا ہے۔ کوئی اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور پھر اسے ایسا معلوم ہوا گویا معبد کے دروازے کھل گئے اور لاکھوں کروڑوں پجاری سمندر کی لہروں کی طرح ہچکولے لیتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ طوفان، بادل کی گرج، بجلی کے چمکتے ہوئے تیز دھارے اور لاکھوں گھنٹیوں کا پُرشور آواہن، لیلا ایک لخت ڈر گئی۔ ایک عجیب خوف وہراس سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ گئی۔

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں آنسو بار بار آئے لیکن نیند ایک دفعہ بھی نہیں۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر وہ جھیل کے کنارے گئی اور دیر تک ا[illegible] چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے بالوں کو دیر تک سنوارا اور دیر تک ہی اپنی نرم نرم اور سونے کی طرح حسین باہوں کو صاف کرتی رہی جب وہ جھیل کے کنارے سے اٹھی تو اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں، اور

ایک انگڑائی لے کر ہنسی - ایک عجیب ہنسی - صبح کی پہلی کرنوں میں اس کے دانت موتیوں کی طرح موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔

جنگل کی طرح جاتے ہوئے راستے میں اس نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک گچھا دیکھا۔ اس نے اسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا - اب اس کی نگاہوں میں نئی چمک تھی اور لبوں پر ایک نئی مسکراہٹ ،

جب مصور نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا - اس نے متوحش اور دردناک لہجہ میں پوچھا " تم اسے کہاں چھوڑ آئیں ؟"

لیکن لڑکی کچھ نہ سمجھی -

مصور اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکی کے قریب گیا اور اس کے شانے زور سے ہلا کر کہنے لگا۔ آہ، یہ تم نے کیا کر دیا، تم نے اسے کہاں چھوڑ دیا ؟

لڑکی کچھ نہ سمجھی ، لیکن مسکرا دی -

مصور گلوگیر لہجہ میں چلایا - وہ کہاں ہے ؟ سچ بتاؤ وہ کہاں ہے ؟ بری لیلیٰ . . . . کم بخت لڑکی ! . . . .

پھر یک لخت مصور نے اس کے شانے چھوڑ دیئے - اس نے حزیں اور شاید خشمگیں نگاہوں سے لڑکی کی نامکمل تصویر کی طرف دیکھا - آہستہ سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اسے چوکھٹے سے باہر کھینچ لیا پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے - آہستہ سے اس نے چوکھٹے کو تہ کیا۔ رنگوں

اور برشوں کے ڈبے کو سنبھالا اور لڑکی پر ایک نگاہ تک ڈالے بغیر مغرب کی طرف مڑ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

چند لمحے گزر گئے، لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر یکایک رونے لگی اور روتے روتے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی "مت جاؤ آہ! اجنبی مصور مت جاؤ!....

لیکن مصور نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوئے جنگل کی مغربی سمت کو جا رہا تھا۔

لڑکی پریشان نگاہوں سے کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مصور کی طرف۔ کبھی اپنی نامکمل تصویر کے ٹکڑوں کی طرف دیکھ لیتی تھی لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

ہوا پیڑھ کے نکیلے پتوں میں گزرتی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ کہیں دور جنگل میں کوئی بھیڑ کا بچھڑا ہوا بچہ چلا رہا تھا۔ بنفشے کے پھولوں کا گچھا لیلےٰ کے پاؤں میں گر پڑا تھا +

سفید پھول

موضع مہنڈر کے موچی کا نام کبالا تھا، کبالا کو آج تک کسی نے گالی دیتے یا جھوٹ بولتے نہ سنا تھا۔ طبعی شرافت کے علاوہ شاید اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ وہ پیدائشی گونگا تھا یوں بھی تو مہنڈر کا گاؤں بودھوں کا گاؤں تھا۔ جہاں ہر ایک فرد سچائی اور اہنسا کا پجاری تھا۔ لوگ جھوٹ بہت کم بولتے تھے۔ چوری چکاری اور ڈکیتی کا نام تک تھا۔ پچھلے دو سو برس میں وہاں قتل کی ایک بھی واردات نہیں ہوئی تھی۔ لوگ مہنڈر میں اس طرح خوش و خرم رہتے تھے جیسے جنت میں۔ یہ بات الگ ہے کہ سماج کی الجھنوں میں پھنس کر گاؤں کے لوگ

بعض اوقات ایسے کام بھی کر بیٹھتے تھے جن پر انھیں بعد میں پچھتانا پڑتا تھا۔ لیکن ایسی باتیں بہت کم پیش آتی تھیں اور پھر یہ تو سماج کی الجھنوں کا قصور تھا۔ نہ کہ ان کا۔

کبالا کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب دیودار کے دو مضبوط درختوں کے سائے تلے۔ لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی اور یہ کبالا کی دکان بھی تھی۔ اور اس کا آبائی گھر بھی۔ مہندر کا خوب صورت گاؤں نیچے تلیٹی میں واقع تھا اور جب ہوا دیودار کے درختوں میں گزرتی ہوئی گیت گاتی اور سورج دیوتا اپنے سنہری رتھ پر سوار ہو کر اونچے دیوداروں کی چوٹیوں کے اوپر سے گزرتے تو نیچے تلیٹی میں گاؤں کی خوب صورت منقش چھتیں اور پرانے بودھ مندر کا منگولی برج شام کی سنہری کرنوں میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا، سورج نکلتے ہی کبالا دکان کے باہر ایک چھوٹے سے اخروٹ کے درخت کے نیچے آ بیٹھتا۔ اور جوتیاں بناتے بناتے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دور نیچے راستے پر گزرتی ہوئی مہ جبینوں

کی طرف دیکھتا جو مٹی کی گاگریں کولھوں پر رکھے یا سر پہ اٹھائے قطار باندھے گیت گاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی جاتی تھیں اور جب وہ پگڈنڈی پر سے گزر جائیں تب بھی وہ ان ہی کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت کبالا کو ایسا محسوس ہوتا گویا اُن کے پاؤں سے چھو جانے سے راستے کی مٹی کا ہر ذرّہ کندن بن کر دمک رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اس کے دل کے اندھیرے میں ایک سونے کی لکیر سی کھنچ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ زور زور سے گائے۔ یہاں تک کہ دور نیچے راہ پہ چلتی ہوئی ماہ جبینوں کے پاؤں رُک جائیں اور وہ نازک اندام سروقد نینا، گاؤں کے نمبردار کی لڑکی بھی ایک ہاتھ گاگر پہ رکھے اور دوسرے ہاتھ سے دھوتی کا پیلا آنچل سنبھالے اس کی طرف تکنے لگ جائے۔ اور ...
... چوٹی کے اوپر چھوٹے سے نیلے آسمان میں اڑتے ہوئے بادل یکایک تھم جائیں اور اس کا پر سوز گیت سننے کے لیے اونچے اونچے دیوداروں کے اوپر جھک جائیں ——
لیکن جب کبالا اپنے لب کھولتا تو اس کے منہ سے ایک

دبی سی چیخ نکل جاتی کرخت اور بلند، جسے سن کر آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے نازک مزاج ککو ہنہولے اور رت گلے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑ جاتے اور کبالا شرمندہ ہو کر اپنے لب زور سے بھینچ لیتا۔ جیسے انھیں سوت کے ٹانکوں سے اس نے خود ہی سی دیا ہو۔

کبالا کی صورت شکل بہت اچھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کسی وحشی ہرن کی سی تھیں اور چہرہ بیضوی۔ اور جب وہ اخروٹ کے درخت کے تلے زانو تہ کئے جوتے بنا رہا ہوتا تو اس کا پاک اور معصوم چہرہ بالکل کسی دیوتا کی طرح معلوم ہوتا۔ صورتیں کس قدر دھوکا دیتی ہیں۔ کبالا کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ آج سے دو سو برس پہلے اسی ہوچی کے ایک بزرگ نے اس گاؤں کے ایک غریب بدھ سادھو کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ کیونکہ اسے شک تھا کہ بودھ سادھو اس لڑکی کو ورغلا رہا تھا جس سے کبالا کے اس بزرگ کو محبت تھی گاؤں میں قتل کی واردات شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اور گاؤں کے پنچوں نے

بڑے غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی جان کے بدلے دوسرے کی جان لینا-ادھرم ہے۔ اس لئے انھوں نے کبالا کے بزرگ کو گاؤں سے باہر نکال دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ جب تک اس خاندان کی سات پشتیں اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کرلیں اس خاندان کے کسی فرد کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ گاؤں کی حدود کے اندر قدم رکھ سکے۔ اس دن سے لے کر گاؤں کے موچی کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع تھی۔ گرمی ہو یا سردی، دھوپ ہو یا برف چار پشتوں سے مہنڈر کے موچی نے گاؤں میں قدم نہ رکھا تھا وہ بہت سی چیزیں کھنیتر کے گاؤں سے لے آتا تھا جو مہنڈر کے کوہساروں کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی وادی میں واقع تھا اور اب تو کھنیتر کے موچی کے خاندان سے مہنڈر کے موچی کے تعلقات اس قدر مضبوط ہوچکے تھے کہ مہنڈر کے موچی کا خاندان بودھ پنچوں کی سزا کو تقریباً بھول گیا تھا۔

ہاں! نوجوان کبالا کے دل میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی

ٹیس اٹھتی، کیونکہ وہ نوجوان تھا اور اکیلا اور گونگا، اس کے ماں باپ مرچکے تھے اور کھینتر کے موچی خاندان کے افراد اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے اس سے متنفر تھے۔ اور دائی اور ذی شی دونوں بہنیں اس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کی دلچسپ حرکات کی جن سے وہ اپنی زبان کا کام لیا کرتا تھا نقلیں اتارتی تھیں اور جب ان کے ہنسی ٹھٹھے میں ان کے تینوں بڑے بھائی بھی شامل ہوجاتے تو گونگے کے دل کا زخم رِس رِس کر بہنے لگتا اور وہ چیخیں مار کر وہاں سے بھاگ جاتا۔

کبالا کا ایک دوست بھی تھا اس کا نام تھا کھنڈا۔ کبالا نے کھنڈا کو ایک دن کھینتر سے واپس آتے ہوئے راستے میں پڑا پایا تھا وہ بھوک سے بے تاب ہوکر چلّا رہا تھا، اس کی ڈائن ماں اسے راستے ہی میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کبالا، کھنڈا کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس نے اسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا، اور کھنڈا بھی کبالا کو بہت چاہتا

تھا، کئی بار جب کھنڈا کبالا کو اُداس دیکھتا تو شوخ نگاہوں سے اس کی طرف تاکتا اور پھر دُم ہلا کر اس طرح چیختا گویا کہہ رہا ہے "گونگے بھیا کیوں اُداس ہو، میری طرف دیکھو۔ میں بھی تمھاری طرح بات چیت نہیں کرسکتا، لیکن کیا میں خوش نہیں ہوں۔ وہ دیکھو اس اخروٹ کی ٹہنی پر کیسی خوب صورت چڑیا بیٹھی ہے اسے لو وہ اڑ گئی، اور پھر کھنڈا چیختے چیختے کبالا کے قدموں کے گرد ناچنے لگتا۔ یہاں تک کہ کبالا کا غم دور ہوجاتا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت آجاتی اور وہ اپنے پیارے کتے کی پیٹھ کو زور سے تھپک کر اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اس وقت اس کی نگاہیں صاف کہہ رہی ہوتیں "کھنڈا بھیّا تم بہت شوخ ہو۔ شوخ اور پیارے۔ شوخی تو اردائی اور ذی سٹی میں بھی ہے۔ لیکن وہ پیاری نہیں ہیں اور نینا میں شرارت نہیں پر وہ بہت اچھی ہے، کیا تم نینا کو نہیں جانتے، وہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے۔ اور اس دن اپنے باپ کے ساتھ یہاں آئی تھی، نہیں جانتے؟ ذلیل

کُتّے ، چلو ہٹو یہاں سے "

اور کھنڈا غرّا کر کہتا ۔ مجھے نمبردار کی کیا پروا ہے اور میں کسی نینا دینا کو نہیں جانتا اور تم مجھے اپنے پاس سے نہیں ہٹا سکتے ۔ میں جنگل کے بھیڑیئے کی مانند ہوں ۔ مجھے کوئی معمولی ایسا ویسا کتّا نہ سمجھنا ! سمجھے ؟

جب کبالا نے نینا کو پہلے پہل دیکھا تو اس دن دُھند چھائی ہوئی تھی ، ایک ہلکی لطیف دُھند جو دیودار کے درختوں کو اپنے سفید لبادے میں لپیٹے ہوئے جنگل کی سبز جھاڑیوں سے لے کر چوٹی کے اوپر آسمان میں پھیلے ہوئے بادلوں تک چلی گئی تھی ، ساری فضا میں صبح کا سناٹا تھا ۔ نہ ہوا چل رہی تھی ، نہ پرندوں کی بولیاں سنائی دیتی تھیں ۔ کیونکہ جب دُھند آجائے تو پرندے بھی خاموش ہو جاتے ہیں ، اس گونگی دنیا میں کبالا پہاڑی جھرنے سے نہا کر واپس آرہا تھا کہ راستے میں ایک چٹان پر کھڑے ہوئے اس نے دُھند کی دیوی کو دیکھا ۔ ہاں یہ دُھند کی دیوی ہی تو تھی ۔ سرو قامت ، سر سے پاؤں تک ایک سفید دھوتی میں ملبوس ۔ اس کا

چہرہ کبالا کو ایسا معلوم ہوا، گویا شبنم کے قطروں میں دھلا ہوا گلاب کا پھول دھند کی ہلکی اور سپید لہروں میں تیر رہا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور منہ کھولے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دُھند کی دیوی نے کہا میں راستہ بھول گئی ہوں۔ میں نینا ہوں۔ مجھے گاؤں کا راستہ دکھا دو۔

کبالا چند لمحوں کے لئے بت کی طرح کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے پیچھے مڑ گیا، اس نے نینا کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ دھند گہری ہو رہی تھی، لیکن اب وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور کبالا سوچ رہا تھا تم نینا ہو۔ تم دھند کی دیوی ہو، تم راستہ بھول کر آ گئی ہو، راستہ، کبالا نینا کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ نازک چھوٹے سے گلابی پاؤں؟ اچھا تو وہ چپّل کیوں نہیں پہنے ہوئے؟ وہ اب ایک ایسا اچھا چپل تیار کرے گا کہ دھند کی دیوی بھی اسے پہن کر خوش ہو جائے۔ پتلا سا چمڑا اور اس پہ باریک نقرئی تاروں کے پھول، خوبصورت

اور ملائم جیسے نینا کے پاؤں، اس کا جی چاہا کہ وہ دیوی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور کہے کہ اپنے پجاری کو ان کی پوجا کر لینے دو اور پھر یکایک اسے خیال آیا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کرسکتا اور وہ اس رازِ عظیم کو اپنے دل کے انتہائی گوشوں میں چھپانے کو تیار ہو گیا۔ اب چلتے چلتے اسے ہر لحظہ ڈر رہنے لگا کہ نینا اس سے کوئی بات نہ پوچھ لے۔ ایک بات ایک لفظ، اور پھر وہ جان لے گی کہ وہ گونگا ہے اور قدرت نے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا ہے۔ خاموش اور بے حس شاید پیدا ہونے پر وہ ایک بار چلّایا ہوگا، لیکن اب تو گویائی کی ایک رمق بھی باقی نہ تھی اور اس کا سازِ حیات بالکل بے حس بے جان اور موت کی طرح ساکن تھا۔ گاؤں کی حد کے قریب پہنچ کر کبالا کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے دھند میں لپٹے ہوئے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

نینا نے ایک لمحہ کے لئے رک کر پوچھا تم کون ہو کہاں سے آئے ہو؟ میں نے پہلے تمھیں کبھی نہیں دیکھ

تم کہاں رہتے ہو ؟

کبالا نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور پھر آنکھیں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد نینا بولی۔ اوہ ——— تم ہو کبالا!

کبالا دیر تک گردن جھکائے۔ بازو لٹکائے کھڑا رہا، اور جب وہ چلنے لگی تو اس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرن کی سی آنکھوں سے نینا کی طرف دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا ؟ وہ کیا کہہ سکتا تھا ؟ "کاش" وہ کچھ کہہ سکتا ؟

نینا آہستہ سے مڑ گئی، سپید دھند میں اس کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ کر کبالا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

× × × × × × × ×

جس دن نینا راستہ بھول کر کبالا کے دل میں اتر آئی تھی، اس دن سے کبالا کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے زمین کے سوئے ہوئے سب سپنے جاگ

اٹھے ہیں مہنڈر کے خلد زاروں میں ایک نئی رعنائی اور دل کشی آ گئی ہے اور اس کی روح میں خوشی اور غم کی حدیں پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے سے مل گئی ہیں شاید اگر وہ گونگا نہ ہوتا تو اس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا۔ اگر اس کی زبان نینا سے اس کے دل کا مدعا کہہ سکتی تو شاید اس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن اب جب کہ اس کے جذبات کے سیلِ بے کراں نے چاروں طرف قدرت کے لگے ہوئے آہنی بند دیکھے تو اس کی روح کی تڑپ اور شعریت اس کی بنائی ہوئی چپلوں اور جوتیوں میں منقلب ہو گئی۔ ان دنوں اس نے چپلوں اور جوتیوں کے ایسے ایسے نفیس اور نادر نمونے ایجاد کئے اس کی شہرت بہت جلد اطراف میں پھیل گئی اور لوگ دُور دُور سے آکر اس سے جوتے اور چپل بنوانے لگے۔ کھنیتر کے موچی نے اس سے اشاروں ہی اشاروں میں کئی بار کہا کہ اب جب کہ تمھاری دکان چمک اٹھی ہے۔ تمھیں شادی کر لینی چاہئے۔ اور اب وہ بغیر کسی معاوضے کے

کبالا کو اروائی یا ذی شی کا رشتہ دینے کو تیار تھا ذی شی اور اروائی بھی تو اب اسے اتنا دق نہ کرتی تھیں۔ اب ان کی نگاہوں میں شوخی کے ساتھ احترام یا شاید کچھ اور جذبات بھی ملے ہوتے تھے۔ شاید اب وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کبالا کو اپنا ہونے والا خاوند سمجھ رہی تھیں۔ اب انھیں کبالا کی بڑی بڑی آنکھوں میں، دیوتاؤں کے سے چہرے میں۔ دل آویز رنگت میں اور لمبے گٹھیلے جسم میں جرأت مردانگی اور خوب صورتی کے تمام لوازم دکھائی دیتے تھے۔ جس طرح تالاب میں کاغذ کی ایک ہلکی سی ناؤ ڈال دینے سے بھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر وہ بڑھتی ہوئی دائرے بناتی ہوئی چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ اسی طرح کبالا کی محبت کی ناؤ نے بھی مہندر کی ساکن فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اور اب یہ لہریں چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ کھنڈا کو اس بات کا پتہ لگ گیا تھا۔ نینا کی سہیلیوں کو اور شاید گاؤں کے اور افراد کو بھی۔ جب گائیں کی دوشیزائیں نینا کو چھیڑتیں تو نینا کو کبالا

پر بہت غصّہ آتا تھا۔ بے وقوف گونگا، پاگل۔ چمار، نہ جانے وہ اسے کیا کیا کچھ کہہ ڈالتی تھی۔ اور بچارے کبالا کو کیا پتہ تھا کہ نینا کا باپ تو ایک عرصہ ہوا نینا کے بیاہ کا معاملہ طے کر چکا تھا۔ اس نے نینا کو تاشی پور کے بودھ سردار سے بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا، بڑی مشکل سے تین ہزار روپیہ پر فیصلہ ہوا تھا۔ تاشی پور کا سردار بہت کنجوس تھا اور دو ہزار سے زیادہ دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ تب نینا کے باپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تاشی پور کے سردار سے اپنی لڑکی بیاہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی پیاری بیٹی کو جہنم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے۔ ہاں تاشی پور جہنم سے کم نہ تھا۔ اونچے اونچے سنگلاخ پہاڑ دشوار گزار راستے۔ ہر وقت برف و باراں، تاشی پور برف کا جہنم تھا، وہ یقیناً اپنی نازک اندام بیٹی کو تاشی پور کے بودھ سردار سے نہیں بیاہے گا۔ آخر بڑی مشکل سے تین ہزار پر فیصلہ ہوا تھا۔

لیکن کبالا اپنی جگہ خوش تھا۔ نینا دو بار اپنے باپ

کے ساتھ اس کی دکان پر چپلوں کا ماپ دینے آئی تھی، نینا کے لئے اس نے ایسے خوب صورت چپل تیار کئے تھے جنھیں دیکھ کر گاؤں کی دوشیزائیں رشک سے جل گئی تھیں۔ نینا کے پاؤں کو جنھیں قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا چھو کر کبالا کے دل میں یہ خواہش آگ کی طرح بھڑک اٹھی تھی کہ وہ ان دو کنول کے پھولوں کو اٹھا کر اپنے سینے میں چھپالے نینا کے باپ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بودھ پنچوں کو کہہ کر کبالا کے خاندان کی سزا کو منسوخ کرانے کی کوشش کرے گا اور غالباً جلد ہی کبالا کو اپنے گاؤں میں واپس آنے کی اجازت مل جائے گی اور پھر نینا کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک اٹھی تھیں اور اس نے نہایت ملتجیانہ انداز میں اپنے باپ سے درخواست کی تھی کہ وہ ضرور غریب کبالا کے خاندان کی سزا منسوخ کرادے۔ ان باتوں کو یاد کرکے وہ جوتیاں بناتے بناتے خود ہی مسکرا پڑتا ہاں وہ بہت خوش تھا۔ وہ دن بھر اچھے اچھے چپل

بناتا۔ کھنڈا کے ساتھ کھیلتا اور صبح وشام اخروٹ کے درخت کے تلے کھڑے ہو کر دُور نیچے گھاٹی کے سنہری راستے پر گزرتی ہوئی ماہ جبینوں کی طرف دیکھتا۔ اُن میں نَینا بھی ہوتی تھی۔ پیلے آنچل والی نینا۔

× × × × × × ×

اور پھر ایک دن گاؤں کے لوہار نے کبالا کو بتایا کہ گاؤں کے نمبردار کی لڑکی نَینا کی شادی ایک دو دن میں تاشی پور کے بودھ سردار سے ہونے والی ہے۔ شادی اونتی پور میں ہوگی جو مہنڈر اور تاشی پور کی درمیانی حد پہ اونچے برفانی پہاڑوں کی ایک تنگنائے میں واقع تھا۔ شادی کی رسوم اونتی پور کا مقدس بودھ پجاری سرانجام دے گا۔ نَینا بڑی خوش قسمت تھی کہ ایک ایسے بڑے سردار سے بیاہی جانے والی تھی جو کسی طرح بھی ایک راجہ سے کم نہ تھا، اور سنا ہے، لوہار نے کہا، کہ نینا کے باپ نے تاشی پور کے سردار سے تین ہزار روپیہ لیا ہے۔ اب یہ سزا دینے والے بودھ پنچ کہاں سو گئے ہیں۔ گاؤں کا

لوہار بہت دیر تک اسی طرح کبالا سے باتیں کرتا رہا اور کبالا سر جھکائے ایک چپّل میں سوت کے ٹانکے لگاتا رہا، اور جب لوہار وہاں سے رخصت ہو گیا، تو نمبردار کا بھیجا ہوا ایک آدمی آ گیا اور اس نے کبالا سے کہا کہ نمبر دار کہتا ہے کہ کبالا سے کہو کہ وہ نینا کے لئے عروسی چپّل کل صبح تک تیار کر دے، کیونکہ انھیں کل صبح ہی ادانتی پور جانا ہے۔ پرسوں نینا کی شادی ہے۔

نینا کی شادی؟ کبالا کے دل میں خیال آیا کہ پہلے تو عروسی چپّل بنانے سے انکار کر دے۔ اس نمبر دار کے بھیجے ہوئے آدمی کا گلا گھونٹ ڈالے نمبر دار کی جان لے لے اور پھر اسی پہاڑ کی چوٹی سے گر کر نیچے کی چٹان پر اپنا سر پٹخ دے۔ لیکن اس نے بڑی مشکل سے آخر اپنے غصّے اور نا امیدی پر قابو پا لیا اور نمبردار کے آدمی سے اشاروں میں کہا کہ وہ نمبر دار کے حکم کی ضرور تعمیل کرے گا۔ لیکن اس وقت اس کے پاس نقرئی تار نہیں ہیں۔ وہ انھیں کھنیتر

سے لائے گا اور کل صبح تک عروسی چپّل ضرور تیار کر دے گا۔

لیکن دوسرے دن جب نمبردار کا آدمی چپّل لینے کے لئے آیا تو کبالا نے ہاتھ جوڑ کر اس سے اشاروں میں کہا کہ عروسی چپّل تیار نہیں ہے، وہ کھنیز گیا تھا لیکن اسے نقرئی تار کہیں سے نہ ملے اور وہ بے نیلِ مرام واپس آ گیا۔ اسے بہت افسوس تھا کہ عروسی چپّل کے تیار نہ ہونے سے شادی میں رخنہ پڑتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرے وہ بالکل ناچار تھا۔ جب نمبردار کے آدمی نے یہ باتیں اپنے مالک سے کہیں تو وہ بہت سیخ پا ہوا۔ اس نے بدبخت گونگے کو بے نقط سنائیں کمینہ، بدمعاش، گونگا، وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا ہے کیا؟ خبیث، شیطان، کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر عروسی چپّل نہ ہوگی تو نینا کی شادی رُک جائیگی وہ اس پاجی کو نینا کی شادی سے واپس آنے پر ضرور مزا چکھائے گا، وہ ایسا انتظام کرے گا کہ مہنڈر کے لوگ تو کیا آس پاس کے کسی گاؤں کا کوئی آدمی بھی

اس کے ناپاک ہاتھوں کا بنا ہوا جوتا نہ پہنے۔ لیکن
زرا وہ اپنی لڑکی کی شادی سے فارغ ہو لے۔

کچھ دیر کے بعد اسی اخروٹ کے درخت کے تلے
کھڑے ہو کر کبالا نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ
اوانتی پور کو جانے والے راستے کی طرف اکٹھے
ہو رہے ہیں، گاؤں کے نمبردار کو اس کے مبارک
سفر پر روانہ کرنے کے لئے، پھر کچھ عرصے کے بعد ڈھول
قرنوں، نفیریوں اور مقدس منتروں کی آواز کے درمیان
نمبردار نینا اور اپنے عزیز و اقارب کو لے کر اوانتی پور
کی جانب روانہ ہو گیا۔ کبالا دیر تک کھڑا دیکھتا رہا
یہاں تک کہ ساز و سامان سے لدی ہوئی خچریں اور
قافلے کے لوگ تنگ راستے سے گزرتے ہوئے اگلے
موڑ پر غائب ہو گئے۔ اس کے سینے سے ایک آہ نکلی،
اچھا! تو یہ اس کی محبت کا انجام تھا۔ لیکن اسے اس
سے بہتر انجام کی امید ہی کیوں ہوئی؟ وہ چپ چاپ
سر جھکائے اپنے لکڑی کے گھر کے اندر داخل ہو گیا
کھنڈا اس کے قدموں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ کبالا نے

غصے میں آکر اسے ایک دو ٹھوکریں لگائیں، لیکن غریب کھنڈا چلایا نہیں۔ بلکہ اپنے مالک کو اداس ننگا ہوا سے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آگیا۔ کبالا نے گھاٹ پر بیٹھ کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کھنڈا نے اپنی تھوتھنی اس کے دونوں پاؤں کے درمیان رکھ دی۔ پھر ایک بہت لمبے عرصہ کے بعد کبالا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کھنڈا کو اٹھا لیا اور اسے گلے سے لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا غریب گونگے کا مضحکہ خیز رونا۔ لیکن اسے دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ ہاں اب اس کا ضمیر اسے بار بار ملامت کر رہا تھا، کہ اس نے نینا کے لئے عروسی چپل کیوں نہ تیار کر دیا۔ چمڑا اس کے پاس تھا، اور نقرئی تار بھی۔ یہ کیسی کمینہ حرکت تھی، آخر اس میں نینا کا کیا قصور تھا؟ اور اب کیا نینا عروسی چپل پہنے بغیر ہی بیاہی جائے گی، ننگے پاؤں، کتنی شرم کی بات تھی لیکن وہ تو اب بھی اس کے لئے ایک ایسا عمدہ عروسی چپل تیار کر سکتا تھا کہ جس پہ کنول کے پھولوں کا دھوکا

ہو، پھر اس نے سوچا کہ وہ کیوں نہ ابھی عروسی چپّل تیّار کرنے کے لئے بیٹھ جائے۔ وہ راتوں رات سفر کرتا ہوا اگلی صبح اوانتی پور پہنچ سکتا تھا اور شادی سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے نینا کے پاؤں میں چپّل پہنا سکتا تھا یہ خیال آتے ہی اس نے چپّل بنانے کا تہیّہ کر لیا اور چمڑا صاف کرنے بیٹھ گیا۔

جب کبالا نے چپّل کو مکمّل کر لیا تو اس وقت مغرب میں شفق کی سرخی بھی باقی نہ رہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑوں پر سیاہ بادل اُمڈ آئے تھے اور اپنے سانس روکے ہوئے پہاڑی کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے، تب دھیمے سے ایک انگڑائی لے کر رات کی رانی جاگ اٹھی اور اس نے بادلوں کو اپنے گرد پا کر خوشی اور مستی سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے پازیب کی جھنکار بودھ مندر کے منگولی برج اور گاؤں کی منقش چھتوں میں لرزتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور اس کی کلائیوں میں پڑے ہوئے نقرئی کنگن رہ رہ کر کوند جاتے تھے، ان ہی کی چمک میں گاؤں کے لوہار اور کمہار نے دیکھا

کہ اوانتی پور کے پُر پیچ اور دشوار گزار راستے پر کبالا سر جھکائے اور بغل میں کچھ دبائے کھنڈ اکو ساتھ لئے جا رہا ہے۔

× × × × × × ×

اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رات مہنڈر کی وادی میں ایک ہیبت ناک چیختا ہوا طوفان آیا، وہ طوفان جس نے پہاڑ کے بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکا، نمبردار کے اونچے گھر کی منقش چھت اڑ گئی اور پرانے بودھ مندر کا برج پارہ پارہ ہوگیا شمالی ہواؤں کے برفانی خزانے چاروں طرف ژالہ باری کرتے گئے اور پھر ایک شدید ہولناک برف باری شروع ہوئی جس نے صبح ہوتے تک مہنڈر اور کھنبتر اور تاشی پور کے کہساروں کو برف کی ایک سفید گہری چادر سے ڈھانپ دیا۔ اور دوسرے دن دوپہر کے وقت جب تاشی پور کا بودھ سردار اپنی دلہن کو لے کر تاشی پور روانہ ہوا، اور برات شہنائیاں بجاتی ہوئی اوانتی پور کی درمیانی بلند گھاٹی میں سے گزری تو براتیوں

نے دیکھا کہ گھاٹی میں سفید برف پر دور تک قدموں
کے نشان پڑے ہیں، اور ایک بڑے تناور درخت
کے نیچے ایک بدقسمت راہ گیر مرا پڑا ہے۔ اس کا کتا
اس کے پاؤں میں منہ دیئے ہوئے اکڑ گیا تھا، راہ گیر
کے ہاتھ اس کی چھاتی پر بندھے ہوئے تھے۔ اور وہ
ان کی مضبوط گرفت میں کوئی چیز تھامے ہوئے تھا
——— یہ ایک پتلا کاغذی چمڑے کا بنا ہوا عروسی
بٹوا تھا اور اس پر چاندی کی تاروں سے کنول کے دو
خوب صورت سفید پھول کڑھے ہوئے تھے +

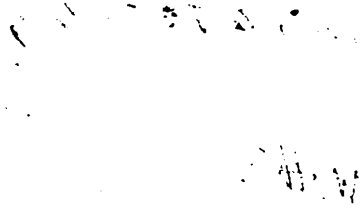

منگلیک

Roshanlal

Iftikhar peshawary.

children
Roshan Lal novel agency
Peshawar

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افرادِ ڈرامہ :-

۱- پران ۲- حمید (دو بیکار گریجوایٹ) ۳- منڈو (نوکر)

وقت- دوپہر- مقام- لاہور- شہر کے اندر ایک اونچے سہ منزلہ مکان کی برساتی-

پس منظر:- سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور حمید جس کی آواز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دم پھول گیا ہے- برساتی کے اندر یہ کہتے ہوئے داخل ہوتا ہے- "پران ؟ ... کہاں ہو؟ ... او پران ؟"

پران:- میں یہاں اس برساتی میں بیٹھا ہوں، حمید! اندر آ جاؤ ... اس طرف-

(کرسی گھسیٹ کر بیٹھنے کی آواز آتی ہے، اور پھر ایک لمبی سانس)

حمید:- اوہ . . . عجیب سیڑھیاں ہیں ، تمہارے مکان کی چڑھتے جاؤ، چڑھتے جاؤ ، کبھی ختم نہ ہوں . . . یہ تم تین منزل اُوپر بیٹھے کیا کر رہے ہو، کوٹھوں پر چڑھنا کہاں کی شرافت ہے؟ مجھ ایسے موٹے آدمی کے لئے اس سے زیادہ اور کیا سزا تجویز کی جا سکتی ہے کہ اُسے تمہارے تین منزلہ مکان کی تنگ اور اندھیری سیڑھیوں پر دن میں ایک دو بار چڑھنے ، اُترنے کو کہا جائے . . . . . اچھی شرافت ہے ؟

پران:- تو اپنے گھر کی برساتی میں بیٹھنا بھی گناہ ہے . . سگریٹ پیوگے ؟

حمید:- ذرا دم لے لوں (ایک لمبی سانس لے کر) ایمان سے . . . تمہارے گھر کی سیڑھیاں قطب مینار کے زینہ کی طرح لمبی اور پیچ دار ہیں . . . ایک گلاس پانی کے لئے کہنا۔

پران:- (ہنس کر) موٹے آدمی کو پسینہ اور غصہ بہت جلد آتا ہے ۔ سوڈا منگاؤں ؟ منڈو . . . او منڈو . . . ابے نالائق . . . چھت پہ آ۔

(دور سے آواز) جی آیا۔

پران:۔ اچھا، دیکھ، وہیں سے میری بات سُن لے، لپک کر نکڑ والی دوکان سے ایک بوتل سوڈا اور ایک پیسہ کی برف ... سُنا تو نے۔

(دور سے آواز) جی ابھی لایا۔

پران:۔ اچھا، تو تم کیا کہہ رہے تھے، حمید؟

(حمید سیگریٹ سلگاتا ہے۔ دیا سلائی جلنے کی آواز)

حمید:۔ (سلگاتے ہُوئے) ہوں ... ہوں ... ہیں کہہ رہا تھا کہ تمیری چھت پر برساتی میں بیٹھ کر دھوپ تاپنا کہاں کی شرافت ہے؟

پران:۔ مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟

حمید:۔ ہوں ... اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ محلّے کی لڑکیوں بہو، بیٹیوں کو پریشان کرتے ہو، اور پھر بھی تمہیں یہ پوچھنے کی جرأت ہوتی ہے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے کیا یہ شریفوں کے چلن ہیں؟ جو بھلے مانس ہوتے ہیں وہ نیچے بیٹھک میں بیٹھتے ہیں، تاکہ محلّے کی تمام عورتیں اطمینان سے چھتوں پر چڑھ کر ایک دوسرے سے بات چیت

کر سکیں . . . اور، اب تم ہی بتاؤ۔ جب سے تم چھت پر آئے ہو، کیا محلّے کی چھتوں پر دو دو فرلانگ تک بھی کوئی عورت نظر آتی ہے، اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو، اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ارے بھائی، کیا تم ہماری معاشرت کی الف، ب، ت، سے بھی واقف نہیں؟

پران:۔ تو کیا ہماری معاشرت یہی کہتی ہے کہ مرد نیچے بیٹھکوں میں سردی سے ٹھٹھریں، اور عورتیں کوٹھوں پر چڑھ کر ایک دوسرے کو کوسنے دے دے کر سارا محلہ سر پہ اُٹھالیں اب دیکھو، جب سے میں یہاں بیٹھا ہوں، یہاں کتنا امن ہے . . . سکون . . . سکوت . . . گہری خاموشی . . . اور دھوپ کیسی خوشگوار ہے . . . جی چاہتا ہے۔ دن بھر یہیں بیٹھا رہوں۔

حمید:۔ اور میرا جی چاہتا ہے، تمہارا مُنہ چُھلس دوں . . . یاد رکھو اگر محلّے کی معاشرت کے خلاف تمہارا چلن یہی رہا تو پھر دو چار روز ہی میں تم پر وہ وہ اتہام تراشے جائیں گے اور یہی محلّے کی خالائیں جو اب تمہیں "کہو بیٹا کیسے ہو؟" اور "بڑا سعادت مند لڑکا ہے۔" کہہ کر

ہمیشہ پچکارتی رہتی ہیں، اُس وقت تمہارے برخلاف وہ وہ طوفان برپا کر دیں گی کہ تمہاری زندگی اجیرن ہوجائے گی اور محلّے میں رہنا دُوبھر۔۔۔۔ میری بات مانو، اب بھی وقت ہے، چپکے سے بیٹھک میں چلے چلو۔

پران:۔ (ہنس کر) بھائی حمید تمہاری باتیں ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہیں۔۔۔ خوشگوار اور بے معنی۔۔۔ تم یہاں آ کر کیسی پُر لطف، بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

حمید:۔ یہ سب تمہارے محلّے کی آب و ہوا کا اثر ہے ۔ تم نے یہاں ناجائز شراب کشید کرنے کی بھٹی تو نہیں لگا رکھی۔

پران:۔ (ہنستا ہوا) بے شک، بے شک، مگر کاش تم محکمہ آبکاری کے انسپکٹر ہی ہوتے، نہ کہ محض ایک بے کار۔

حمید:۔ محکمہ آبکاری نہ سہی تو محکمہ بے کاری ہی سہی۔ تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔

پران:۔ پھر بھی۔۔۔ اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

حمید:۔ تم اپنی کہو، میں تو آج کل "السٹریٹڈ ویکلی" کے معمے حل کرتا ہوں۔

پران۔ ارے، وہ کب سے؟

حمید:۔ کوئی ایک ہفتے سے، بات یوں ہوئی، کہ گذشتہ اتوار کو نیلے گنبد کے موڑ پر انارکلی کی طرف جاتے ہوئے مجھے یکایک نیّر مل گیا۔

پران۔ کون اکرام نیّر، جو بی اے میں ہمارا ہم جماعت تھا۔

حمید:۔ ہاں .... ہاں ... وہی بطخ کے چوزے جتنا بلند و بالا۔ تو وہ مجھے نیلے گنبد کی طرف ایک نئی ڈارک بلیو رنگ کی کار کے دروازے پر مل گیا، مجھ سے ملتے ہی کہنے لگا۔ ہیل۔ لو حمید بٹیا تم اتنے دنوں کہاں رہے؟

پران۔ تو تم نے اس سے کیا کہا۔

حمید۔ میں نے اس سے کیا کہا؟ میں اس سے کیا نہ کہہ سکتا تھا؟ تم ہی ذرا خیال کرو کہ تمہارا ایک ہم جماعت جسے کالج کی زندگی میں تم نے "ننھے مینڈک" سے زیادہ اچھا لقب کبھی نہ دیا ہو۔ تمہیں اگر دو برس کے بعد یکایک ایک ڈارک بلیو کار ....

پران (قطع کلام کرکے) بس، بس، میں سمجھ گیا (ہنستا ہے)

حمید:۔ اچھا تو تم سمجھ گئے کہ میں نے اُسے کیا کہا ہوگا۔

پران:۔ (ہنستے ہوئے) ہاں، ہاں، مگر یار یہ تو بتاؤ کہ پھر اس نے کیا کہا!

حمید۔ وہ کہنے لگا وہ آج کل جبل پور میں اگزکٹو آفیسر ہے، کنٹونمنٹ

میں ساڑھے تین سو روپے تنخواہ لیتا ہے اور فرسٹ گریڈ میں ہے یہاں وہ اور اس کی بیوی کرسمس کے دنوں میں نمائش دیکھنے آئے ہیں، نمائش کا تو ایک بہانہ ہے، ورنہ میرے خیال وہ تو محض اپنی اور اپنی بیوی اور اپنی ڈارک بلیو کار کی نمائش کرنے یہاں آیا ہے، خاص کر اپنے دوستوں کو چڑانے کے لئے، اور ....

پران۔ (قطع کلام کرکے) معاف کرنا مگر تم نے اس کی بیوی دیکھی؟

حمید۔؟ ارے یار اُس نے اُس وقت تک میری خلاصی نہ کی جب تک اس نے مجھ سے یہ وعدہ نہ لے لیا کہ میں دوسرے دن شام کے پانچ بجے فایو (۵)، گاف روڈ پر اس کے ہاں چائے پیوں گا، ناچار دوسرے دن مجھے اس کے ہاں جانا پڑا، وہاں پتہ لگا کہ آنجناب نے گاف روڈ والی کوٹھی نئی نئی لی ہے۔

پران۔ پھر تو اس نے گن گن کر بدلے لئے ہوں گے۔

حمید۔ کچھ نہ پوچھو، شاید کالج کے دنوں کے زخم اس کے دل میں اب تک تازہ تھے، پہلے تو کہنے لگا، بھئی حمید کیا کروں۔ تمہاری طرح عیش تو نہیں کرتا، مزدور آدمی ہوں، سارا دن دفتر میں کام کرتا ہوں یا پھر دورے پر رہتا ہوں، ساڑھے تین سو تنخواہ ملتی ہے۔ امیر طبیعت بیوی ہے۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ عجب مصیبت ہے۔

(سیڑھیوں پر ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ حمید خاموش ہو جاتا ہے)

منڈرو۔(دبلی آواز میں) بابو جی، سوڈا، برف نہیں ملی، دکاندار بولا آج کل سردیوں میں کون پاگل برف مانگتا ہے میں نے کہا بابو جی برف مانگتے ہیں اس نے نہیں دی ہم نے بہتیرا .....

(حمید زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

پران ۔جاؤ، جاؤ، نیچے کام کرو، بے وقوف کہیں کا۔

(سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ، آواز آہستہ آہستہ ہلکی ہوتی جا رہی ہے اور پھر بالکل گم ہو جاتی ہے)

پران۔ ہاں تو پھر اکرام نے تمہیں اپنی بیوی دکھائی ہوگی۔

حمید۔(وقفے کے بعد، گلاس کو میز پر رکھتا ہے) بیوی؟ ارے میاں اس کمبخت نے تو اپنے گھر کا ایک ایک کونہ مجھے دکھایا۔ یہ سٹڈی روم ہے یہ ڈرائنگ روم ہے۔ یہ ڈائیننگ ہال۔ پردے پسند کرو، ولایتی صوفوں پر شاعرانہ مبالغہ آرائی کرو۔ کرسیوں، چائنا، گھر کے کتنے بھ‌ کے ساتھ عزت سے پیش آؤ، تصاویر، میز پوش، گلدان، غالیچے، ریڈیو سیٹ، اس کے بعد یہ ہیں بیگم اکرام، مجھ سے اس طرح باتیں کرنے لگیں۔ جیسے میں نے زندگی بھ

کبھی کوئی خوب صورت عورت نہیں دیکھی اور اکرام صاحب پاس کھڑے کھڑے مسکرا رہے تھے،
سمجھتے ہوں گے کہ دنیا میں اگر کسی کو حسین بیوی ملی تو صرف انہیں، اور باقی سب دوسرے لوگ تو محض اونٹنیوں سے نکاح کرتے ہیں۔

پران۔ تو۔ پھر؟
حمید۔ تو اس دن سے معمے حل کرتا ہوں!
پران۔ (ہنستے ہوئے) اچھی سزا ملی تمہیں
حمید۔ (جواب میں ہنستے ہوئے) پران۔ کچھ عجب چکر ہے زندگی کا۔ میں سوچتا ہوں اس ننھے مینڈک کو ملازمت کیسے مل گئی۔ سوچتا ہوں کمبخت نے کوئی فریب کیا ہوگا۔

پران۔ گوبند کی طرح!
حمید کون گوبند؟
پران۔ ارے وہی تو، موٹے، موٹے پھولے ہوئے گالوں والا، جو کالج میں لٹریری کلب کا جونیر وائس پریزیڈنٹ ہوا کرتا تھا۔
حمید۔ ہاں، ہاں، یاد آگیا مگر اُس کے متعلق کیا بات ہے؟
پران۔ اچھا، تو کیا تمہیں پتہ نہیں، جناب وہ بمبئی گیا۔ کسی فلم کمپنی میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ تھوڑا بہت گا لیتا

تھا، بس جناب وہاں ایک دو مہینے کی سر توڑ کوشش کے بعد وہ آخر ایک گھٹیا قسم کی فلم کمپنی میں نوکر رکھ لیا گیا۔ اس .... اُس کمپنی کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں رہا ہاں تو وہاں جناب کی ایک فلم ایکٹریس سے شناسائی ہو گئی۔

حمید۔ ارے!

پران۔ آگے تو سنو۔ تو جناب بس ایک دن آپ اُس کے سارے زیور لے بھاگے۔ ست لڑے ہار اور کنگن اور نفیسیاں اور کڑے اور بازو بند اور گلوبند اور نہ جانے کیا کیا۔

حمید۔ آخر پکڑا گیا؟

پران۔ ہاں ناسک میں پکڑے گئے ..... ڈھائی سال کی سزا بھی ہو گئی

حمید۔ ڈھائی سال تو زیادہ نہیں ... اور پھر زیور بھی بہت ہوں گے!

پران۔ نہیں، وہ تو سب پیتل کے نکلے۔ ملمع شدہ ..... بچارا غریب گوبند!

حمید۔ مگر وہ فلم ایکٹرس کیا ہوئی مجھے تو بہت سمجھ دار عورت معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم اس سے شادی ....

پران۔ (قطع کلام کر کے) شاید تمہارا دل للچا گیا ہے۔ ارے میاں اس کی کئی بار شادی ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے وہ دس مردوں

کو طلاق دے چکی ہے۔

حمید۔ یہ گیارھواں کون ہے؟

پران۔ ایک فلمی رسالے کا ایڈیٹر تھا۔ بھلا سا نام ہے، ابوظفر کہ کیا؟.....

حمید۔ فلم ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری واقفیت خوب ہے۔

پران۔ اور کیا! اپنا اپنا شوق ہے، تمہیں آج کل السٹریٹڈ ویکلی کے معمّے حل کرنے کا شوق چرّایا ہے، میں فلم ایکٹرسوں کے متعلق معلومات جمع کرتا رہتا ہوں۔

حمید۔ ابوظفر؟.... ابوظفر..... ارے یہ کہیں وہی ابوظفر تو نہیں جو چند سال پہلے ہمارے کالج کے رسالے کا ایڈیٹر تھا اور جس کی ایک آنکھ کانی تھی۔ اور جو مس اوشا رانی پر اپنی آنکھ رکھتا تھا۔

پران۔ کونسی آنکھ؟ کانی؟

حمید۔ (ہنستے ہوئے) نہیں ... دوسری!

پران۔ پھر اُس کا کیا ہوا۔

حمید۔ کس کا؟ ... اُس کی کانی آنکھ کا؟

پران۔ نہیں۔ میرا مطلب ہے، اوشا کا؟

حمید۔ وہ، سنا ہے، آکسفورڈ چلی گئی ہے، وہاں اُس نے ایک اینگلو انڈین سے شادی کر لی ہے .... ارے، وہ کیا ہے؟

پران۔ کیا ہے؟... پتنگ؟

حمید۔ نہیں ... ایک لڑکی۔

پران آسمان میں اڑتی ہوئی؟

حمید۔ (آہستہ سے) نہیں، بے وقوف، وہ دیکھ سامنے مکان کی کھڑکی میں

پران۔ (لبوں پر انگلی رکھ کر) شش۔ش، ش (سرگوشیانہ انداز میں) کرسی ذرا اِدھر کھینچ لو، (کرسی گھسیٹنے کی ہلکی سی آواز آتی ہے) یوں سامنے بیٹھے رہے تو تمہیں دیکھ کر بھاگ جائے گی۔

حمید۔ ایمان سے... بہت خوبصورت ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ تمہارے محلے میں خوب صورت عورتیں بھی ہوتی ہیں.....

بس بالکل مورت معلوم ہوتی ہے، اس سیاہ چسکٹ اور آسمانی دوپٹے میں وہ بالکل پری معلوم ہو رہی ہے۔ پران، یہ ہے کون؟

پران۔ یہ کملا ہے!

حمید۔ شش ش ش، آہستہ کہو، مبادا وہ سُن پائے

پران۔ یہ کملا ہے!.... میں اس سے بے اندازہ محبت کرتا ہوں

میں کیا محلے کے سب لڑکے اس سے بے اندازہ محبت کرتے ہیں۔

حمید۔ اس کی نگاہوں میں ایک عجیب چمک ہے۔ کانوں میں لٹکتے ہوئے آویزے کرن کی طرح دمک رہے ہیں۔ صندلی کلائیوں میں پہنی ہوئی چوڑیاں سورج کی شعاعوں کے عکس سے شعلے بن گئی ہیں، ایمان سے . . . .

پران۔ آؤ نیچے چلیں، یہاں دھوپ اب تیز ہوگئی ہے۔

حمید۔ دھوپ؟ یہاں دھوپ کتنی خوشگوار ہے۔ جی چاہتا ہے سارا دن یہیں بیٹھے رہیں۔

پران۔ (جیسے کسی سبق کو دہرا رہا ہو) . . . جو شریف لوگ ہوتے ہیں وہ نیچے بیٹھک میں بیٹھتے ہیں، تاکہ محلے کی عورتیں اطمینان سے چھتوں پر . . . .

حمید۔ پران! تمہیں نقل اتارنے کی بہت بُری عادت ہے۔

پران۔ (اُسی لہجے میں) تو کیا تم ہماری معاشرت کی الف، ب، ت سے بھی واقف نہیں۔

حمید۔ پران!

پران۔ حمید!

(دونوں ہنس پڑتے ہیں)

حمید۔ ایلو، وہ چلی گئی، آنکھ جھپکتے ہی اوجھل ہوگئی اور یہ سب تمہارا قصور ہے، وہ بے چاری سمجھتی ہوگی کہ ہم دونوں شاید اُس پر ہنس رہے تھے،

پران۔ گھبراؤ نہیں، وہ پھر آئے گی۔

حمید۔ کیوں؟ کیا اُسے بھی تم سے محبت ہے۔

پران۔ نہیں تو، مگر وہ آج بہت مسرور ہے اور وہ اپنی خوشی کو چھپانا نہیں چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے دل کی خوشی کو دیکھے اُس کے جاں سوز حسن کا نظارہ کرلے، اس کی دلفریب مسکراہٹ کی بہار لوٹ لے۔ جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے، بس کوئی پندرہ بیس دن ہیں۔ کل رات سے ان کے گھر میں ڈھولک بجنی شروع ہوگئی ہے۔ گیت گائے جا رہے ہیں۔ مٹھائی بانٹی جا رہی ہے محلے کی خالائیں دن رات شادی کی رسموں پر جھگڑتی رہتی ہیں، محلّے کی بہو بیٹیاں مکلّف لباس زیب تن کئے۔ ہنستی ہوئی، ایک دوسرے کو چھیڑتی ہوئی اٹھلاتی پھرتی ہیں بے چاری غریب عورتیں یہی دو چار دن ان کے ہنسنے بولنے کے ہوتے ہیں، انہی دو چار دنوں میں وہ اپنی ہمجولیوں سے اچھی طرح مل سکتی ہیں۔ کوئی شادی یا پھر کوئی موت ..... ورنہ ان کی تمام زندگی تو بس گھر کے

ڈربوں میں بند رہ کر گزر جاتی ہے۔

حمید۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو، کوئی کام کی بات کہو . . . . . ہاں . . . مگر یہ تو بتاؤ بھائی جان۔ جب تمہیں کملا سے بے اندازہ محبت تھی تو پھر یہ محبت شادی کا باعث کیوں نہ ہوئی؟

پران۔ شادی! کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو، تم بھی بالکل گدھے ہو، ارے میاں شادی اور چیز ہے، محبت اور چیز ہے، اور پھر ہمارے ہاں تو شادی کے لئے محبت ایک بالکل غیر ضروری امر ہے۔ ہندوستانی معاشرت میں بھائی حمید، محبت ایسی فرسودہ چیز کون پوچھتا ہے، یہاں تو یہ پوچھا جاتا ہے کہ لڑکی کا باپ کیا لیتا ہے۔ کتنا امیر ہے؟ جہیز میں کیا دے گا؟ اور کئی درجنوں تکلیف دہ باتیں . . . . میں نے کوشش تو بہت کی لیکن ان باتوں کے چکر میں پڑ کر ہماری محبت کا گلا ہی گھونٹ ڈالا گیا، اور پھر ایک اور بات بھی تھی، میں شاید ان تمام دشواریوں پر قابو پا لیتا اگر . . .

حمید۔ اگر؟

پران۔ اگر کملا کو مجھ سے محبت ہوتی . . . اگر کملا کسی اور سے محبت نہ کرتی۔

حمید۔ ایمان سے . . . . !

پران۔ ہاں ... کملا کو جگدیش سے محبت ہے۔ وہ ہمارے محلے ہی میں رہتا ہے اور سچ پوچھو تو وہ ہے بھی اس کی محبت کے لایق۔ میری طرح نہیں کہ چھچھوندر کی طرح شکل ہو، اور بانس کی طرح قد، وہ میانے قد کا نوجوان ہے، چوڑی چھاتی، گندمی رنگ، خوبصورت آنکھیں، ... اور کملا تو اُسے پوجتی ہے۔ بی اے میں پڑھتا ہے، باپ ریلوے میں نوکر ہے، تین سو کے قریب تنخواہ لیتا ہے ... میں نے کئی بار کملا اور جگدیش کو ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا ہے اور یوں تو یہ قصّہ محلے کی سب عورتیں اچھی طرح جانتی ہیں، ایک دفعہ بڑا شور مچا تھا، کملا کے باپ نے جگدیش کے باپ سے ملنا چھوڑ دیا، اور کملا کی ماں اور جگدیش کی ماں ایک دوسرے سے روٹھ گئیں اور بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ محلّے کی ایک بوڑھی خالہ نے جگدیش اور کملا کو گھر کی سیڑھیوں پر ہنستے ہوئے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا ... بوڑھی خالہ نے وہ طوفان بپا کیا ..... وہ طوفان بپا کیا کہ .....

حمید۔ اچھا، تو گویا اب کملا اور جگدیش کی شادی ہوگی۔

پران۔ ارے ... نہیں ... میاں ... تم بات بھی تو سنو؟

حمید۔ تو کیا کملا ....؟

پران۔ (قطع کلام کرکے) ہاں میں کہتا ہوں کہ کملا کی شادی جگدیش سے نہ ہوگی، اس کی شادی کیلئے بہت دیر تک دونوں گھروں میں گفتگو ہوتی رہی، آہستہ آہستہ عورتیں بات چیت کرتی رہیں، اور دونوں گھروں میں پھر سے پرانے اور اچھے تعلقات کا سلسلہ بندھ گیا اور پھر اس بات کا چرچا سب محلے میں ہوگیا بوڑھی خالائیں ناک پر انگلی رکھ کر بڑے چاؤ سے اس ہونے والے بیاہ کا ذکر کرتی تھیں "موئے آگ لگے اس زمانے کو، شرم نہ حیا ..... جب ہمارا بیاہ ہوا تھا ...." اور اس قسم کی بہت سی باتیں، اب کملا اور جگدیش بہت خوش تھے چنانچہ اب کملا بہت کم جگدیش کے سامنے آتی تھی اور اگر کبھی جگدیش کو نظر بھی آجاتی تو مسکرا کر اور بدن چرا کر فوراً وہاں سے بھاگ جاتی۔

حمید۔ ہاں، ہاں پھر کیا ہوا،

پران۔ سنو تو سہی، اسی دوران میں ایک ایسی بات ہوئی جس نے سب معاملہ چوپٹ کر دیا! ABOLT FROM THE BLUE

حمید۔ وہ کیا؟

پران۔ جگدیش منگلیک نکلا۔

حمید۔ منگلیک؟

پران۔ ہاں، ہاں، منگلیک

حمید منگلیک؟ کیا کسی بیماری کا نام ہے!

پران۔ (ہنستے ہوئے) جوتشیوں اور رمّالوں کی اصطلاح میں منگلیک ان لڑکے لڑکیوں کو کہتے ہیں جو منگل کے روز پیدا ہوئے ہو

حمید۔ تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے، کیا منگل کے روز پیدا ہونا گنا ہے۔

پران۔ نہیں، لیکن جب محلّے کے بوڑھے جوتشی نے دونوں کی جنم پتریاں دیکھیں تو اُس نے سر ہلا کر کہا لڑکا منگلیک ہے۔ اس لئے یہ شادی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ کملا منگلیک نہ تھی،

حمید۔ مگر کیا شادی کے لئے یہ ضروری ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئے ہوں؟

پران۔ سب کے لئے تو ضروری نہیں، لیکن جو لڑکا منگلیک ہو، وہ کسی ایسی ہی لڑکی ہی سے شادی کر سکتا ہے جو اس کی طرح منگل کے روز پیدا ہوئی ہو، ورنہ نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، اگر ایک لڑکی جو خود منگلیک نہیں ایک ایسے مرد سے بیاہی جاتی ہے جو منگلیک ہے۔ تو ایسی صورت میں ان کا بیاہ بہت برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یا تو وہ عورت جلد مر جاتی ہے۔ یا اس کے

اولاد نہیں ہوتی، یا اُسے اور کسی طرح کی روحانی یا جسمانی تکلیف پہنچتی ہے اور یہی حال اُن مردوں کا ہوتا ہے جو خود منگلیک نہ ہوں اور کسی منگلیک عورت سے بیاہ کرلیں۔ خود ہمارے خاندان میں ایک ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔ میرے ماموں جان نے ایک منگلیک عورت سے بیاہ کرلیا تھا، اور وہ خود منگلیک نہ تھے، شادی کے پورے گیارہ ماہ بعد وہ مر گئے۔

حمید۔ منگل کے روز!

پران۔ نہیں دن تو مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔

حمید۔ اچھا؟

پران۔ ہاں، اس لئے اب جگدیش کی شادی کملا سے نہ ہوگی، کملا کی سگائی اب ایک اور لڑکے سے ہوگئی ہے، نام ہے شیام سندر وہ لائل پور کا رہنے والا ہے، گو شکل و شباہت سے افریقہ کا باشندہ معلوم ہوتا ہے، میں نے اسے دیکھا ہے۔ یہاں بی اے میں پڑھتا ہے، چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں، باہر نکلے ہوئے کان، بالکل بندر معلوم ہوتا ہے۔۔۔ اور اب جگدیش اور کملا کے گھر والوں کی آپس میں بول چال اور ملاقات بالکل بند ہے، اور ——— ۔

حمید۔ شش ش۔ ش۔ ش ۔۔۔ وہ کھڑکی میں آگئی ہے ۔۔۔۔۔۔ جد
کس قدر حسین ہے۔ لبوں پر کیسی، دلفریب مسکراہٹ ہے۔
۔۔۔۔۔۔ یہ کھڑکی سے نیچے جھک کر کسے دیکھ رہی ہے۔
پران۔ (آہستہ سے) ٹھہرو میں جھروکے میں سے دیکھتا ہوں ۔۔۔ گلی
تو بالکل خالی ہے!
حمید۔ یہ اس کے دائیں بازو میں کیا بندھا ہے؟
پران ۔۔۔ یہ چاندی کے دو "کلیرے" ہیں، جب نوجوان لڑکیوں
کی شادی کے دن قریب ہوں تو یہ کلیرے انہیں پہنا دیئے
جاتے ہیں۔
حمید۔ مسکرا رہی ہے ۔۔۔۔۔ بچارا جگدیش!
پران۔ حمید، عورت کی محبت کا اعتبار کیا!
WOMAN THY NAME IS FRAILTY

حمید۔ مسکرا رہی ہے ۔۔۔۔۔ بازو میں بندھے ہوئے کلیرے اس
کی خفیف سی حرکت سے ہوا میں جھومنے لگتے ہیں۔ اور اُن سے
کیسی عجیب، میٹھی، سریلی سی آواز پیدا ہو رہی ہے، یہ جھک کر
کسے دیکھ رہی ہے۔ پران، ذرا جھروکے میں سے دیکھنا
کون ہے؟

پران . . . . نہیں . . . گلی تو بالکل خالی ہے۔

حمید۔ (ایک دم کرسی سے اچھل کر اونچی آوازیں) میرے خدا . . . .

یہ کیسے ہو گیا

پران کیا ہے؟ . . . .

(نیچے گلی سے) جیسے کسی نے اناج کی بوری چھت سے فرش پر پھینک دی ہو ایک ہیبت ناک چیخ، پران چلا اٹھتا ہے "کملا نے کھڑکی سے چھلانگ . . . . ہائے . . . . ہائے . . .

پران کرسی پر سے بے تحاشا اٹھ کر جھروکے کی طرف بھاگتا ہے شیشے کا گلاس، تڑی اور کتابیں زمین پر آرہتی ہیں، ان چیزوں کی مختلف آوازیں، حمید خوف زدہ لہجے میں "میرے اللہ" ۔ ۔ اور پھر "ہاں . . . جھروکے کی طرف مت جاؤ" نیچے شور بلند ہوتا جا رہا ہے۔ چیخیں، عورتوں کے رونے کی آوازیں۔ "پولیس" "پولیس" لوگوں کے ادھر ادھر دوڑنے کی آوازیں، "کیا ہوا، کیا ہوا" "کملا! "کملا! "کملا!!!" بہت سے قدموں کی چاپ . . . .

لوگو میں مر گئی، میں لٹ گئی"، "کیا ہوا" قدموں کی چاپ" سامنے سے ہٹ جاؤ۔ یہ شور ڈرامے کے ختم ہونے تک جاری رہتا ہے اور بتدریج کم ہوتا جاتا ہے)

حمید۔ (خوف زدہ لہجہ میں) یہ کیا ہو گیا، پران ۔ ۔ ۔ اُف میرا تو کلیجہ
منہ کو آ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پران۔ ظالم کملا ۔ ۔ ۔ وہ جگدیش ہے، وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آ رہا ہے اُس کے
خوبصورت بال ماتھے پر بکھرے ہوئے ہیں، اس کی آنکھوں سے
آنسو جاری ہیں ۔ ۔ ۔

حمید۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا ۔ ۔ ۔ پران تم بھی ادھر آ جاؤ

پران۔ (مسحور اور دردناک آواز میں) ۔ ۔ ۔ جگدیش نے اُسے اپنی گود میں
لے لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کملا کی چھاتی سے خون کے فوارے ابل رہے
ہیں۔ اور گلی کا فرش سرخ ہوتا جا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ جگدیش رو رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سُرخ سُرخ خون میں
چاندی کے کلیرے نہا رہے ہیں!

حمید۔ میرے اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے اللہ ۔ ۔ ۔ پران جھروکے سے ہٹ جاؤ

پران۔ کملا کی آنکھیں جگدیش کے چہرے پر جم گئی ہیں، جگدیش پتھر کا
بت بنا گلی کے فرش پر بیٹھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن آنکھوں کی
چمک کم ہوتی جا رہی ہے۔

حمید۔ پران!

کملا کے منہ سے خون اُبل رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آنکھیں کھل گئیں
لیکن فوراً [illegible] اور [illegible] پران [illegible]